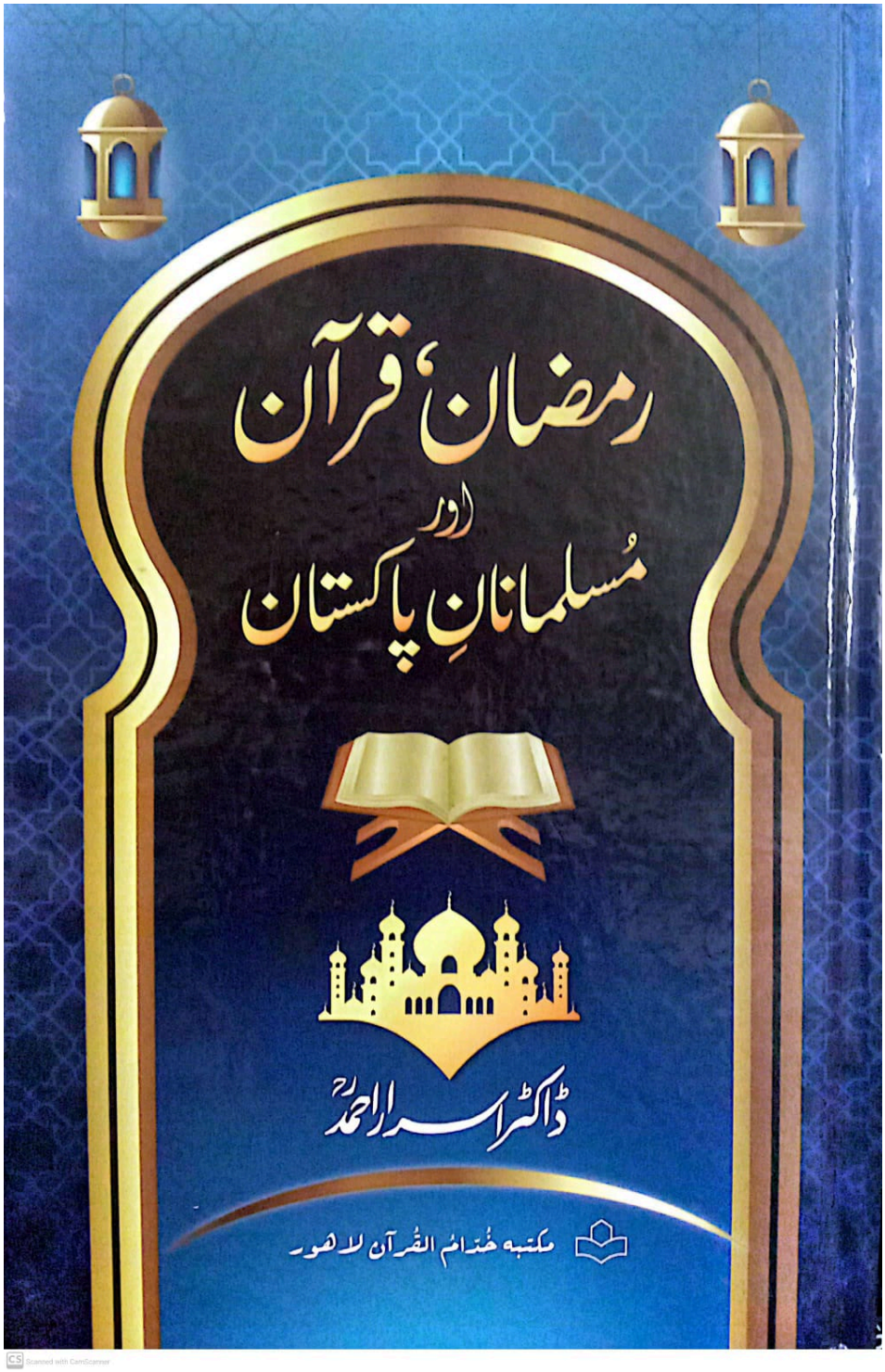


رمضان قرآن اور مسلمانان پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

حدیث قدسی ((فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ)) کی روشنی میں

روزہ کے بارے میں حدیثِ قُدسی کے مندرجہ بالا الفاظ متفق علیہ ہیں' یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں:

(۱) صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی الله عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((قَالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَہٗ اِلَّا الصِّیَامُ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ .....))

(۲) صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں حسبِ ذیل الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((یَتْرُكُ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ وَشَهْوَتَہٗ مِنْ اَجْلِیْ' الصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ.....))

(۳) صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ یُضَاعَفُ : اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ' قَالَ اللهُ تَعَالٰی: ''اِلَّا الصَّوْمَ' فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ' یَدَعُ شَهْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنْ اَجْلِیْ.....))

(بحوالہ 'ریاض الصّالحین' للامام النووی)

اَلصَّوْمُ لِیْ

جملہ عباداتِ اسلامی ------ صلوٰۃ وزکوٰۃ اور صوم و حج ------ میں سے عبادتِ صوم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے بارے میں متعدد روایات کی رُو سے، جن میں بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت بھی شامل ہے، ایک حدیث قدسی میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ))

''روزہ خاص میرے لیے ہے اور مَیں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔''

جنہیں بعض لوگوں نے اعراب کے ذرا سے فرق کے ساتھ یوں بھی پڑھا ہے کہ:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ))

''روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں!''

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نماز خدا کے لیے نہیں؟ اسی طرح کیا زکوٰۃ اور حج اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب صرف نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے واضح ارشادات ہیں:

(۱) {وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾} (طٰہٰ)

''اور قائم کر نماز میری یاد کے لیے!''

(۲) {حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی * وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾} (البقرۃ)

''محافظت کرو نمازوں کی اور خاص طور پر نماز وسطیٰ کی' اور کھڑے رہو اللہ کے لیے پوری فرمانبرداری کے ساتھ!''

(۳) {وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ} (آلِ عمران:۹۷)

''اور لوگوں کے ذِمّے ہے اللہ کے لیے حج بیت اللہ' جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔''

(۴) {وَ اَتِمُّوا الۡحَجَّ وَ الۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ ؕ} (البقرۃ:۱۹۶)

''اور پورا کرو حج اور عمرے کو اللہ کے لیے۔''

(۵) {اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوۡرًا ﴿۹﴾} (الدھر)

''ہم کھانا کھلاتے ہیں تمہیں صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے' اور تم سے طالب ہیں نہ کسی جزا کے نہ شکریے کے!''

اس اشکال کا ایک سطحی سا حل بعض حضرات نے اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے کہ روزے میں ریاء ممکن نہیں ہے جب کہ بقیہ تمام عبادتوں میں ریاء کا امکان ہے' اس لیے کہ روزے کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہے جو لوگوں کو نظر آسکے' بلکہ وہ ایک راز ہے عبد اور معبود کے مابین۔ ظاہر ہے کہ یہ توجیہہ بالکل بے بنیاد ہے' اس لیے کہ

نماز میں ریاء یہی تو ہے کہ پڑھے تو انسان نماز ہی لیکن خالصۃً لِوَجہِ اللہ نہ پڑھے ‘بلکہ اس میں لوگوں کو دکھانے کی نیت شامل ہو جائے‘ بعینہٖ یہی معاملہ روزے کے ساتھ بھی ممکن ہے ------ رہی دوسری انتہائی صورت کہ انسان روزے سے نہ ہو اور لوگوں سے کہے کہ مَیں روزہ سے ہوں تو یہ ریاء نہیں دھوکا اور فریب ہے اور اس کے مقابل کی صورت نماز کے معاملے میں یہ ہوگی کہ کوئی ظاہراً تو نماز کے لیے دست بستہ کھڑا ہوجائے لیکن بجائے سورۂ فاتحہ کے کوئی عشقیہ اشعار شروع کردے۔ یا نعوذ باللہ من ذلک‘ خداتعالیٰ اور رسول ﷺ کو گالیاں دینا شروع کر دے !---- -- پھر ایک نصِ قطعی کے طور پر موجود ہے وہ حدیث بھی جس کی رُو سے آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیَ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیَ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیَ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (رواہُ احمد‘ مشکوٰۃ‘ باب الریاء والسُّمعۃ)

’’جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا‘ اور جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا‘اور جس نے خیرات دی دکھاوے کی غرض سے وہ بھی شرک میں ملوث ہو چکا !‘‘

اس حدیث ِقُدسی کا یہی وہ اشکال ہے جس کے باعث یہ عام و اعظین کے مواعظ

میں تو بیان ہو جاتی ہے لیکن اسلام کے جدید ’مفکرین‘ کی تحریر و تقریر میں بار نہیں پاتی ۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ دین کے بہت سے دوسرے لطیف تر حقائق جیسے عہدِ اَلست‘ وَحی‘ الہام‘ کشف اور رُئویائے صادقہ وغیرہ کی طرح اس حدیثِ قُدسی کی حقیقت بھی اُن لوگوں پر منکشف نہیں ہوسکتی جو دَورِ حاضر کے مادّہ پرستانہ اور عقلیت پسندانہ رُجحانات کے زیراثر رُوحِ انسانی کے جسدِ خاکی سے علیٰحدہ مستقل وجود اور جُداگانہ تشخص اور اس کے ذاتِ باری کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق کے یا تو سرے سے قائل ہی نہیں ہیں یا کسی درجے میں ہیں بھی تو اُس کے اعتراف و اعلان میں جھجک اور حجاب محسوس کرتے ہیں ! بقول اکبرؔ الٰہ آبادی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں !

اس لیے کہ اس حدیث ِقُدسی کی واحد ممکن توجیہہ یہ ہے کہ روزہ روح کے تغذیہ و تقویت کا ذریعہ ہے ‘جسے ایک تعلق خاص اور نسبتِ خصوصی حاصل ہے ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ‘ لہٰذا یہ گویا خاص اللہ کے لیے ہے جس کی جزاوہ بطورِ خاص دے گا۔یایوں کہہ لیں کہ چونکہ اس کا حاصل ہے تقرب الی اللہ تو گویا اللہ خود ہی بنفسِ نفیس اُس کی جزا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ 'ارواحِ انسانی' کا ایجاد و اِبداع 'اجساد' کی تخلیق سے بہت پہلے ''جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃ''(مُسلم عن ابی ھُریرہ رضی اللہ عنہ)کی صورت میں ہوا۔اور حضرت آدم علیہ السلام کی عالمِ اَجساد میں تخلیق سے بہت قبل خود اُن کی اور اُن سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی اَرواح مستقل جداگانہ تشخص اور پورے شعورِ ذات اور فیمابین جملہ امتیازات کے ساتھ موجود تھیں۔

اس حقیقت کے ادراک و شعور کے بغیر' واقعہ یہ ہے کہ عہدِاَلست کا وہ اہم واقعہ جسے قرآن مجید نے بڑے اہتمام اور شدّو مدّ کے ساتھ بیان کیا ہے اور جسے محاسبہ اُخروی کے ضمن میں ایک اہم حُجّت قرار دیا ہے یا تو محض تمثیل و استعارہ قرار پاتا ہے یا پھر اس کے

10

بارے میں اچھے اچھے مصنّفین کے قلم سے بھی نادانستہ انتہائی لغو اور مہمل جملے نکل جاتے ہیں۔(۱) سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہ عہد اَجسادِ انسانی کی تخلیق سے قبل عالمِ اَرواح میں ارواحِ انسانی نے پورے ہوش اور شعور کے ساتھ کیا اور میدانِ حشر میں جب تمام نسل انسانی دوبارہ(۲) ''جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃ''کی صورت میں اپنے خالق کے سامنے پیش ہوگی تو یہی عہدِ الست اُن کے خلاف حُجّتِ اولیٰ کے طور پر پیش ہوگا !(''مبادا تم کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ یا یوں کہنے لگو کہ اصل میں تو شرک کا ارتکاب کیا تھا ہم سے بہت پہلے ہمارے آباءو اَجداد نے اور ہم تو بعد میں اُن کی نسل میں پیدا ہوئے تھے !''سورۃ الاعراف 'آیات ۱۷۲'۱۷۳)

اسی طرح اس حقیقت کو جانے اور مانے بغیر کوئی توجیہہ ممکن نہیں ان متعدد احادیث کی جن سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نہ صرف یہ کہ خلق کے اعتبار سے سب پر مقدّم ہیں بلکہ آپؐ اُس وقت بھی نبی تھے جبکہ ابھی جسدِ آدمؑ تخلیق و تسویہ کے مراحل سے گزر رہا تھا -------اس سلسلے میں اس روایت سے قطع نظر جس میں ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں' اس لیے کہ وہ محدثین کرام کے نزدیک مستند نہیں ہے' آخر اس حدیث کی کیا توجیہہ ممکن ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! مَتٰی وَجَبَتْ لَکَ النُّبُوَّۃُ؟ قَالَ: وَآدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ ! (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن)

(۱) مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: ''یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالمِ غیب میں خدا نے اُس سے لیا ہے''۔ (تدبر قرآن ،جلد سوم، صفحہ ۳۹۴)

(۲) {وَ عُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۬ؕ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَکُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۸﴾} (الکھف)

''اور وہ پیش کیے جائیں گے اپنے ربّ کے سامنے صف در صف (تب وہ فرمائے گا کہ) آپہنچے ہو تم ہمارے پاس بالکل اسی طرح جس طرح ہم نے پیدا فرمایا تھا تمہیں پہلی بار۔ لیکن تم تو اس مغالطے میں مبتلا ہوگئے تھے کہ ہم تمہارے لیے اس ملاقاتِ مَوعُودہ کے لیے کوئی وقت نہ متعین کریںگے !''

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا :یا رسُول اللہ !آپؐ کو نبوت کب ملی؟فرمایا :''اُس وقت جبکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی !)'' (ترمذی بحوالہ ترجمان السُنّہ اوّل)

ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اجسادِ انسانی کی تخلیق سے بہت قبل ارواحِ انسانی خلعتِ وجود سے مشرف ہو چکی تھیں اور اُن کے مابین مراتب و مناصب کے جملہ امتیازات بھی موجود تھے !

بعد ازاں جیسے ہی آدم کے جسدِ خاکی کا ہَیُولیٰ تخلیق و تسویہ کے طویل مراحل طے کرکے اس قابل ہوا کہ روحِ آدم اس سے ملحق کی جا سکے تو نفخِ روح ہوا اور روح و جسد کا یہ مجموعہ مسجودِ ملائک قرار پایا ،بفحوائے آیاتِ قرآنی (الحجر):

۱۔ {وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۸﴾فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۲۹﴾ }

''اور(یاد کرو) جب کہا تمہارے ربّ نے فرشتوں سے 'مَیں پیدا کرنے والا ہوں اس سَنے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر کھنکھنانے لگا ہے ایک بشر' تو جب مَیں اسے پوری طرح مکمل کر چکوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تو گر پڑنا اُس کے لیے سجدے میں۔''

۲۔ {اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿ ۷۱ ﴾ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿ ۷۲ ﴾ }(صٓ)

''اور(یاد کرو) جب کہا تمہارے رَب نے فرشتوں سے 'مَیں بنانے والا ہوں مٹّی سے ایک بشر۔ تو جب میں اسے پوری طرح بنا کر درست کردُوں اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑنا اُس کے لیے سجدے میں۔''

اور پھر پوری نوعِ انسانی کو صُلبِ آدم سے متعلق کر دیا گیا۔ چنانچہ جیسے جیسے ارحامِ اُمہات میں افرادِنوعِ انسانی کے اجساد تیار ہوتے رہے ایک خاص مرحلے پر جنودِ ارواح میں سے ایک ایک روح ان کے ساتھ متعلق کی جاتی رہی۔ جس کو تعبیر کیا سورۃ المؤمنون میں ''خَلۡقًا اٰخَرَ'' کے الفاظِ مبارکہ سے 'اور جس کی خبردی مزید وضاحت کے ساتھ صادق و مصدوق

علیہ الصلوۃ والسلام نے ۔ ازروئے آیات و حدیث مندرجہ ذیل:

۱۔ {وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ﴿ ۷ ﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ۚ﴿ ۸ ﴾ ثُمَّ سَوّٰىہُ وَ نَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ .....}(السّجدۃ)

''اور اُس نے انسان کی تخلیق کا آغاز کیا مٹّی سے۔ پھر چلائی اس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے۔ پھر اس کو درست کیا پوری طرح اور پھونکا اس میں اپنی روح میں سے.....''

۲۔ {وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰہُ نُطۡفَۃً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَۃَ مُضۡغَۃً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ۟ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ﴿ ۱۴ ﴾ }(المؤمنون)

''اور ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹّی کے خلاصے سے۔ پھر کردیا ہم نے اس کو ایک بوند جمے ہوئے ٹھکانے میں۔ پھر بنایا اس بُوند سے ایک علَقہ اور پھر بنایا اس علَقہ سے ایک لوتھڑا' پھر بنائیں اس لوتھڑے سے ہڈیاں' پھر پہنایا ہڈیوں کو گوشت' اور پھر اٹھایا اسے ایک اور ہی اٹھان پر۔ سوبڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب سے اچھی تخلیق فرمانے والا!''

۳۔ عَنْ اَبِی عَبدِالرَّحمٰنِ عَبدِ اللہِ بْنِ مَسعُودٍ رضی اللہ عنہ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللہِ ﷺ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ: ((اِنَّ اَحَدَکُمْ یُجْمَعُ خَلْقُہٗ فِی بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً' ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ' ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ' ثُمَّ یُرْسَلُ اِلَیْہِ الْمَلَکُ فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ)) (رواہ البخاری و مسلم)

''ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی اکرم ﷺ نے' جو سچّے ہیں اور ان کی سچائی مُسلّم ہے کہ: ''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق رحم مادر میں چالیس دن تو نطفے کی صورت میں ہوتی ہے' پھر اتنے ہی دن علَقہ کی صورت میں' پھر اتنے ہی دن مُضغہ کی صورت میں۔ پھر اس کے بعد ایک

فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں رُوح پھونکتا ہے۔''(اس حدیث کو روایت کیا امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے)

واضح رہے کہ یہاں روح سے مراد زندگی لینا بہت بڑا مغالطہ ہے' اس لیے کہ بے جان تو نہ وہ ''بَیْضَۃُ الْاُنْثٰی'' ہی ہوتا ہے جو طویل مسافت طے کر کے رحم میں پہنچتا ہے اور نہ ''نُطْفَۃُ الرَّجُل'' جو نہایت جوش و خروش سے حرکت کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اس میں داخل ہوتا ہے۔ رہے علَقہ اور مُضغہ تو ان میں تو نشوونما کا خالص حیاتیاتی عمل انتہائی زور شور سے جاری ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بے جان مادّے میں زندگی پھونکنے کا کوئی سوال نہیں' بلکہ جسدِ انسانی کے ساتھ' جو تخلیق وتسویہ کے مراحل طے کر رہا ہے' روحِ انسانی کے الحاق کا معاملہ ہے' فَافْھَمْ وَتَدَبّر!

اب آئیے اصل موضوع کی طرف !

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے: ایک اس کا وجودِ حیوانی جو مجموعہ ہے جسم اور جان یا جسد و حیات دونوں کا اور دوسرے روحِ(۳) انسانی ‘جس کے شرف و مجد کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی طرف نسبت دی ! {وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِيْ} ایک کا تعلق ہے عالمِ خلق سے جس میں تخلیق و تسویہ کا عمل لازماً تدریج و ارتقاء کے مراحل سے ہو کر گزرتا ہے ‘ جب کہ دوسرے کا تعلق ہے عالمِ امر سے جہاں ابداع اور ایجاد و تکوین کا ظہور کن فیکونی شان کے ساتھ ہوتا ہے ‘ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

۱۔ {وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ}(بنی اسرائیل: ۸۵)

’’اور وہ پوچھتے ہیں تم سے روح کے بارے میں۔ کہو رُوح میرے رَبّ کے امر سے ہے !‘‘

---

(۳) اکثر لوگ روح کو حیات یا زندگی کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں ‘حالانکہ زندگی تو جمیع حیوانات ہی نہیں نباتات تک میں ہے۔ وہ روحِ ربّانی جس سے انسان جملہ حیوانات سے ممیّز ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے !

۲۔ {وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿ ۵۰ ﴾} (القمر)

’’اور نہیں ہے ہمارا امر مگر بس ایسے جیسے ایک لپک نگاہ کی !‘‘

۳۔ {اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿ ۸۲ ﴾} (یٰس)

’’اور اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ وہ بس کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور ہو جاتا ہے !‘‘

مزید برآں ----- ایک کا رجحان ہے عالمِ سفلی کی طرف جبکہ دوسرے کی پرواز ہے عالمِ علوی کی جانب' بلکہ ایک بالقوہ ''اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ''(۴) کے حکم میں ہے تو دوسرے کا اصل مقامِ اعلیٰ ''عِلِّیِّیۡنَ''(۵) میں ہے' ایک خاکی الاصل ہے اور '' کُلُّ شَیۡءٍ یَرۡجِعُ اِلٰی اَصۡلِہٖ''(٦) کے مصداق ''وَلٰکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ''(۷) کی مکمل تصویر' جبکہ دوسرا نوری الاصل اور ع :'' اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن !'' کے مصداق ہمیشہ عالمِ بالا کی جانب مائل و متوجّہ ۔ ایک خالصتہً حیوانات کی سطح پر ہے تو دوسرا فرشتوں کا ہم رُتبہ ہی نہیں بالقوہ اُن سے بھی آگے ! بقولِ شیخ سعدیؒ ؎

آدمی زادہ طُرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیواں !

گویا دونوں باہم متضادو متصادم ہیں۔چنانچہ ایک تقویت پاتا ہے تو دوسرا لازماً مضمحل ہوتا ہے اور ایک کا دبائو بڑھے تو دوسرے کا کچلا جانا لازمی ہے ! چنانچہ بطن وفرج کے تقاضوں کی بھرپور تسکین اور کثرتِ آرام وا ستراحت سے روح مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ وہ وقت بھی آجاتا ہے جب انسان کا جسدِ خاکی چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا الغرض ہر اعتبار سے زندہ ہی نہیں خوب فربہ (۸)و توانا نظر آتا ہے درآنحا لیکہ اس کی رُوح' کمزور اور لاغر ہوتی ہوتی بالآخر سسک سسک کر دَم توڑ دیتی ہے اور جسدِ انسانی اس رُوح کے لیے چلتی پھرتی قبر بن کر رہ جاتا ہے بقول علّامہ اقبال ع ''رُوح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا

_____(۴) سورۃ التین:۵ (۵) سورۃ المطفّفین:۱۸
(٦) ایک مقولہ:''ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے !'' (۷) سورۃ الاعراف:۱۷٦
(۸) قرآنِ حکیم نے ایک سے زائد مقامات پر منافقین کے 'تن و توش' کی جانب خصوصی اشارے کیے ہیں' مثلاً سورۃ المنافقون میں فرمایا: >>

جسد !''اور بفحوائے الفاظِ قرآنی:
{اِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ}(النمل:۸۰' الروم:۵۲)
''یقیناً (اے نبی ﷺ !) تم نہیں سنا سکتے (اپنی بات) مُردوں کو اور نہ سنا سکتے ہو (اپنا پیغام) بہروں کو !''

افسوس کہ دورِ حاضر میں مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر کے تسلّط کے باعث روح اور جسد کے جداگانہ تشخص اور ان کے تقاضوں کے باہم متضادو متصادم ہونے کا شعور و ادراک عوام تو کجا خواص تک کو حاصل نہیں رہا۔ حتیٰ کہ بہت سے جدید 'مفکرینِ اسلام' تو اس حقیقتِ کبریٰ کا ذکر بھی بطرزِ استہزاء و استحقار کرتے ہیں۔چنانچہ عصرِ حاضر کے ایک بہت بڑے 'مفکرِ اسلام'(۹) ''اسلام کا روحانی نظام'' کے عنوان سے ایک نشری تقریر میں فرماتے ہیں:

''فلسفہ ومذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کار فرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں' دونوں کا عالم جُدا ہے' دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں..... اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے.....''

اس ضمن میں انہوں نے دنیا پرستی ' اور ترکِ دنیا' کی دوانتہائی صورتوں کی جو تردید کی ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے' لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کی توجّہ اس حقیقت کی جانب کیوں منعطف نہ ہوئی کہ انسانی تاریخ میں ان دونوں انتہائوں کی موجودگی بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ انسانی شخصیت میں دو بالکل متضاد اور مخالف قوتیں کارفرماہیں' جن کے مابین مسلسل رسّہ کشی جاری رہتی ہے۔چنانچہ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے

>>{وَ اِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ

} (آیت:۴)

''اور(اے نبی ﷺ !) جب تم انہیں (منافقین کو) دیکھتے ہو تو ان کے تن و توش سے متاثر ہوجاتے ہو۔ چنانچہ جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کو بغور سنتے ہو۔ حالانکہ در حقیقت وہ سوکھی لکڑیوں کے مانند ہیں جنہیں سہارے سے رکھ دیا گیا ہو۔''

(۹) مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم

کبھی دوسری کا۔بقول علّامہ اقبال ؎

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں

کبھی سوزو سازِ رومیؔ کبھی پیچ و تابِ رازیؔ

اسلام بلاشبہ ان کے مابین توازن پیدا کرنا چاہتا ہے اور عدم توازن (۱۰) کو ہرگز پسند نہیں کرتا ‘لیکن توازن کا یہ تصوّر بجائے خود دلیلِ قاطع ہے جسد اور روح کے تضاد اور ان کے تقاضوں کے باہم متقابل و متبائن ہونے کی ۔بقول شاعر ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای !

باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش !

واقعہ یہ ہے کہ فکر و نظر کی اس بنیادی غلطی نے تصوّرِ دین کی پوری عمارت ہی کو کج کر ڈالا ہے۔ چنانچہ جب ’روح‘ صرف زندگی کے ہم معنیٰ ہو کر رہ گئی تو ’دین‘ بھی بس ایک ’نظامِ حیات‘ بن کر رہ گیا اور مذہب کا ایک ایسا لا مذہبی(Secular) ایڈیشن تیّار ہو گیا جس میں مذہب کے لطیف حقائق سرے سے خارج از بحث ہو گئے ؎

خشت ِاوّل چوں نہد معمار کج ! تا ثریّا می رود دیوار کج ! !

ایک حقیقت کی جانب مزید توجّہ فرمالیجئے !

جسد ِ انسانی یا انسان کا وجودِ حیوانی خاکی ٗالاصل ہے‘چنانچہ اس کی جملہ ضرورتیں اور

---

(۱۰) اگرچہ عدمِ توازن کی تمام صورتیں برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ بہت فرق ہے اس عدمِ توازن میں جو دنیا پرستی یا شکم پروری و شہوت پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس عدمِ توازن میں جو ترکِ دنیا یا رہبانیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ سابقہ اُمتوں میں عدمِ توازن کی پہلی صورت کی مثال یہود ہیں جنہیں ''المَغْضُوب عَلَیہم'' قرار دیا گیا ہے اور دوسری صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہیں صرف ''الضَّالِّین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید تقابل کے لیے دیکھئے سورۃ الحدید' جس کے وسط میں یہود کا ذکر ہے جن کی دنیا پرستی نتیجہ تھی 'قساوتِ قلبی' کا اور آخر میں مُتّبعینِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے جن کی رہبانیت کو اگرچہ بدعت قرار دیا گیا لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ تھی یہ نیکی کے جذبے ہی کی ایک غیر معتدل صورت !

اس کے تغذیہ و تقویت کا تمام سامان بھی زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے' جبکہ روح انسانی قدسی الاصل اور'' امر ربّ'' ہے' لہٰذا اس کے تغذیہ و تقویت کی ضرورت بھی تمام تر کلام ربّانی ہی سے پوری ہو سکتی ہے' جسے قرآن حکیم نے روح (۱۱) ہی سے تعبیر کیا ہے' ازروئے آیاتِ مبارکہ:

(۱) {وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَ لَا الۡاِیۡمَانُ وَ لٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا نَّہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ} (الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح (اے نبی ﷺ !) ہم نے وحی کی تمہیں ایک رُوح اپنے امر سے۔ (اس سے پہلے) تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا' لیکن (اب) بنا دیا ہے اسے ایک نُور جس کے ذریعے ہدایت دیتے ہیں ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں !''

(۲) {یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ} (المؤمن:۱۵)

''اِلقاء فرماتا ہے روح اپنے امر سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے !''

(۳) {یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ}(النحل:۲)

''نازل فرماتا ہے فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے امر سے ' اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے !''

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں: ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قراءت و استماعِ قرآن ! اور اگرچہ ان میں

_____(۱۱) یہاں اس حقیقت کی جانب بھی توجّہ ہو جائے کہ وحی کے لانے والے کو بھی قرآن نے کہیں ''روح القدس'' سے موسوم فرمایا ہے اور کہیں ''الرُّوح الامین'' سے اور مہبطِ وحی بھی قرار دیا ہے' قلب کو جو دراصل بمنزلہ 'شاہ درہ' ہے شہر روح کے لیے ۔ تو حقیقت وحی کے ضمن میں بھی ایک کلید مل جاتی ہے اگرچہ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے ! گویا وحی خود بھی روح' اس کے لانے والا بھی روح اور اس کا مہبط بھی روح۔ جگرؔ کا ایک شعر اس نغمۂ وحی کی ماہیت کو خوب واضح کرتا ہے ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو روح سنے اور روح سنائے !

سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے' تاہم قرآن مجید اور احادیث ِ نبویہ علی صاحبھا الصلوۃ والسلام دونوں نے اشارۃً اور کنایۃً واضح فرما دیا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزوِ لاینفک ! چنانچہ قرآن نے وضاحت فرمادی کہ روزوں کے لیے ماہِ رمضان معیّن ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآنِ مجید نازل ہوا تھا۔ گویا یہ ہے ہی نُزولِ قرآن کا سالانہ جشن !

{شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ} (البقرۃ: ۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا''

اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کر دیا کہ رمضان المبارک میں 'صیام' اور 'قیام' لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ:

۱۔ امام بیہقی ؒ نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضور ﷺ کا 'شعب الایمان' میں نقل کیا ہے' اس کے الفاظ ہیں:

((جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا))

''اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا فرض اور اس کا قیام اپنی مرضی پر۔''

گویا قیام اللیل اگرچہ ''تَطَوُّعًا'' ہے تاہم اللہ کی جانب سے 'مجعول' بہر حال ہے !

۲۔ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:
((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ))
''جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیے گئے اُس کے تمام سابقہ گناہ' اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیے گئے اُس کے جملہ سابقہ گناہ۔''

۳۔ امام بیہقیؒ نے 'شعب الایمان' میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ: اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ' فَیُشَفَّعَانِ))
''روزہ اور قرآن دونوں بندۂ مؤمن کے حق میں سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے رب ! مَیں نے اسے روکے رکھا دن میں کھانے اور خواہشات سے 'پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما ۔ اور قرآن کہے گا : مَیں نے روکے رکھا اسے رات کو نیند سے 'پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما ۔ تودونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔''

اور اب غور فرمائیے صومِ رمضان کی حکمتوں پر!

حقائقِ متذکرہ بالا کے پیشِ نظر صیام و قیامِ رمضان کی اصلی غایت و حکمت اور ان کا اصل ہدف و مقصود ایک جملے میں اس طرح سمویا جا سکتا ہے کہ :... ایک طرف روزہ انسان کے جسدِ حیوانی کے ضعف و اضمحلال کا سبب بنے تاکہ روحِ انسانی کے پائوں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کچھ ہلکی ہوں اور بہیمیت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی اور سسکتی اور کراہتی ہوئی روح کو سانس لینے کا موقع ملے ... اور دوسری طرف قیامُ اللیل میں کلامِ ربّانی کا روح پرور نزول (۱۲)اس کے تغذیہ و تقویت کا سبب بنے ...تاکہ ایک جانب اس پر کلامِ الٰہی کی عظمت کَماحَقُّہٗ منکشف ہوجائے اور وہ اچھی طرح محسوس کرلے کہ یہی اُس کی بھوک کو سیری اورپیاس کو آسودگی عطا کرنے کا ذریعہ اور اُس کے دُکھ کا علاج اور درد کادرماں ہے ! اور دوسری جانب روحِ انسانی از سرِ نو قوی اور توانا ہوکر''اپنے مرکز کی طرف مائل

پرواز'' ہو۔ گویا اس میں تقرب الی اللہ کا داعیہ شدّت سے بیدار ہوجائے اور وہ مشغولِ دعا و مناجات ہو جو اصل روح ہے عبادت (۱۳) کی اور لب ِلُباب ہے رُشد و ہدایت کا !

_____(۱۲) ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحب ِکشّاف ! (اقبالؔ)

(۱۳) احادیث ِنبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام : ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ'' اور ''اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ'' (ترمذی)

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں صوم و رمضان سے متعلق آیات (۱۴) میں:

اوّلاً -----مجرد صوم کی مشروعیت اور اس کے ابتدائی احکام کا ذکر ہوا اور اس کی غرض و غایت بیان ہوئی ''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' کے الفاظ میں اور

ثانیاً -----صومِ رمضان کی فرضیت اور اس کے تکمیلی احکام کا بیان ہوا اور اُس کے ثمرات و نتائج کا ذکر ہوا دو طرح پر:

ایک ----- {وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿ ۱۸۵ ﴾} کے الفاظ میں جو عبارت ہے انکشافِ عظمت ِنعمت ِقرآن اور اُس پر اللہ کی جناب میں ہدیۂ تکبیر و تشکّر پیش کرنے سے ----- اور

دوسرے -----{وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿ ۱۸۶ ﴾} کے الفاظ میں، جو عبارت ہے انسان کے متوجّہ الی اللہ و متلاشیٔ قربِ الٰہی اور مشغولِ دُعا اور محوِ مناجات ہونے سے، جو اصل حاصل ہے عبادتِ رَبّ کا !

الغرض ! صیام و قیامِ رمضان کا اصل مقصود یہ ہے کہ روحِ انسانی بہیمیت کے غلبے اور تسلط سے نجات پاکر گویا حیاتِ تازہ حاصل کرے اور پوری شدّت و قوت اور کمالِ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے ربّ کی جانب متوجّہ ہوجائے !

اب ذرا ایک بار پھر سوچیے کہ یہ 'روحِ انسانی' درحقیقت ہے کیا؟ جیسے کہ پہلے واضح ہوچکا ہے' یہ ''اَمرِ رَبّی'' بھی ہے اور جلوۂ ربّانی بھی ۔ اس کا تعلق ذاتِ خداوندی کے ساتھ بالکل وہی ہے جو سورج کی ایک کرن کا سورج کے ساتھ کہ لاکھوں اور کروڑوں میل دور آجانے کے باوجود اپنے منبع سے منقطع اور اپنے جداگانہ وجود کے باوصف اپنی اصل سے منفصل نہیں ہے ------بعینہٖ یہی کیفیت ہے روحِ انسانی کی کہ اپنے علیحدہ تشخص کے باوجود خدا سے منفصل نہیں بلکہ متصل ہے' بقول عارفِ رومیؒ ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست ربُّ الناس را با جانِ ناس !

_____(۱۴) سورۃ البقرۃ: آیات ۱۸۳ تا ۱۸۷

گویا قلب ِ انسانی کی مکین روحِ ربّانی براہ راست متصل ہے ذاتِ رب کے ساتھ اور یہی ہے وہ عظیم امانت جس کے بارِگراں کے نہ سماوات متحمل ہو سکے نہ ارض و جبال' لیکن جو حصّے میں آئی ظلوم و جہول انسان (۱۵) کے: ؎

آسماں بارِ امانت نتواں گشت کشید قُرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند !

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث ِقُدسی کی رو سے قلب ِمؤمن کی مکین خود ذاتِ الٰہی ہے:

((مَا وَسَعَنِی اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ وَسَعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ))

''مَیں نہ زمین میں سما سکا نہ آسمان میں' البتہ اپنے مؤمن بندے کے دل میں میری سمائی ہو گئی۔'' (احیاء العلوم الدین' امام غزالی' ج ۳' ص ۱۴')

؎ من نہ گنجم در زمین و آسماں لیک گنجم در دلِ مؤمن عیاں ! (سعدیؒ)

تو کیا بالکل درست نہیں یہ قولِ مبارک کہ ''اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ''...بلکہ ''اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ''---

---اس لیے جب کہ دوسری بدنی اور مالی عبادتوں کا حاصل ہے تزکیہ و تطہیرِ نفس وہاں صومِ رمضان کا حاصل ہے

تغذیہ و تقویتِ رُوح‘ جو متعلق ہے براہِ راست ذاتِ خداوندی کے ساتھ ------ لہٰذا روزہ ہوا خاص اللہ کے لیے۔ اب چاہے یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی اس کی جزا دے گا یا یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی بہ نفسِ نفیس اس کا انعام ہے‘ کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ‘اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی کوئی بندہ خلوص و اخلاص کے ساتھ اُس کی طرف متوجّہ ہو وہ بھی کمالِ شفقت و عنایت کے ساتھ اُس کی طرف متوجّہ ہوجائے ------ یہاں تک کہ ایک حدیث ِقُدسی کی رو سے اگر بندہ اُس کی جانب چل کر آتا ہے تو وہ بندے کی جانب دوڑ کر آتا ہے اور اگر بندہ اُس کی طرف بالشت بھر بڑھتا ہے تو وہ بندے کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہے ------ گویا بقول علّامہ اقبالؔ مرحوم ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں !
راہ دکھلائیں کسے؟ رَہروِ منزل ہی نہیں !

* * *

_____(۱۵) سورۃ الاحزاب‘ آیت ۷۲

قرآن حکیم کے حقوق

اور اس کے عملی تقاضے

جامع مسجد ناظم آباد نمبر۵‘ کراچی میں
رمضان المبارک کا پہلا خطابِ جمعہ
(بتاریخ:۶ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ / ۱۶ مئی ۱۹۸۶ء)

الحمد للہ وکفٰی والصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خَصُوْصًا عَلٰی خاتم النبیّین محمد الامین وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ اجمعین ۔

اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

{شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡہُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَہِدَ مِنۡکُمُ الشَّہۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ ؕ وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَ لِتُکۡمِلُوا الۡعِدَّۃَ وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾} (البقرۃ)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ((یَا اَھْلَ الْقُرآنِ لَاتَتوَسَّدُوا الْقُرآنَ وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیلِ وَالنَّھَارِ وَافْشُوْہُ وَتَغَنَّوْہُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (شعب الایمان)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ۔ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْہُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَھُدًی

وَّرَحْمَۃً، اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنَا مِنْہُ مَا نَسِیْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْہُ مَا جَھِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَہٗ آنَاءَ اللَّیْلِ وَاَطْرَافَ النَّھَارِ وَاجْعَلْہُ لَنَا حُجَّۃً یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ(آمین !)

معزز حاضرین ! اگرچہ میرا یہ خیال تھا کہ میں آج عظمت قرآن کے موضوع پر گفتگو کروں، لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ مضمون زیادہ تر علمی نوعیت کا ہے، جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہدایات و تعلیماتِ قرآنیہ کے کچھ عملی پہلو ہمارے سامنے آئیں۔ اگر علم میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور عمل میں ترقی نہ ہو تو یہ مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے دین کا مزاج یہ ہے ------اور یہ مزاج صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بہت نمایاں تھا ------ کہ وہ علمی نکات کی طرف زیادہ نہیں جاتے تھے بلکہ قرآن مجید کے عملی پہلوئوں پر زیادہ توجہ صرف کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے علم میں ہوگا کہ ہمیں اس بات سے روکا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں بحث کریں، بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے انعامات و احسانات پر زیادہ غور کیا کرو۔ اللہ کی ذات پر غور کرو گے اور اس کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش کرو گے تو فتنہ میں مبتلا ہو جائو گے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ کمال پر اجمالی ایمان زیادہ مفید ہے۔ مثال کے طور پر اللہ سمیع و بصیر ہے، وہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی۔ لیکن کیسے سنتا ہے اور کیسے دیکھتا ہے؟ جہاں اس چکر میں پڑے گمراہ ہو جائو گے۔ اللہ الحی ہے، وہ زندہ ہے، لیکن اُس کی حیات اور زندگی کیسی ہے؟ جہاں اس کو معین کرنے کی کوشش کرو گے گمراہی میں مبتلا ہو جائو گے۔ صحیح اور محتاط طرزِ عمل اور رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو۔ اُس کی

آیاتِ آفاقی و انفسی پر تفکر و تدبر کرو اور اس سے آگے بڑھ کر اُس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرو۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ روش صحیح نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی عظمت کو تو زیادہ شدّومدّ کے ساتھ بیان کیا جاتا رہے اور آپؐ جو مشن لے کر تشریف لائے تھے اس پر ہماری توجّہ کم رہے۔ آپ ﷺ کی حقیقی عظمت تو ہمارے وہم و خیال سے بھی بالاتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس پر زیادہ قوتِ لسانی صرف کریں تو کہیں نہ کہیں توہین کے

مرتکب ہو جائیں۔ اس لیے کہ کسی کی عظمت بلند تر ہو اور ہم اسے کم تر بیان کریں تو یہ گویا ایک نوع کی توہین ہے اور ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حقیقی عظمت جس قدر اعلیٰ و ارفع ہے وہ ہمارے تخیل و توہم سے ماوراء ہے۔ اس میں محنت کریں گے اور قوتِ بیان صرف کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اصل طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ سوچا جائے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہماری نسبت اور تعلق درست ہے یا نہیں! حضور ﷺ کے دامن سے صحیح وابستگی ہے یا نہیں! حضور ﷺ کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور ہم انہیں کس حد تک ادا کر رہے ہیں! آج (۱۹۸۶ء) سے لگ بھگ چودہ سال قبل میں نے اسی مسجد میں ''نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی، جسے بعدازاں کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اس کتابچے کا موضوع یہی ہے کہ ہماری نجاتِ اُخروی کا دار و مدار اصلاً اس بات پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں درست ہوں اور حضور ﷺ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح ہو۔

یہی معاملہ قرآن مجید کا ہے۔ قرآن مجید کی عظمت کا موضوع بھی یقیناً بہت اہم ہے۔ خود قرآن مجید میں قرآن کی عظمت کا بیان مختلف اسالیب اور مختلف پیرائوں میں آیا ہے۔ کہیں تمثیل کے پیرائے میں فرمایا: {لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ} ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ (پہاڑ) دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے''۔ {وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿ ۲۱ ﴾} (الحشر) ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں''------قرآن کی عظمت کا صحیح ادراک تمہارے لیے ممکن نہیں ہے، کوئی تصوّر کر سکتے ہو تو اس مثال سے کرو۔ قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اس کلام پاک کی مدح فرمائی ہے۔ جیسے سورۂ یونس میں فرمایا:

{يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ

وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿ ۵۷ ﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿ ۵۸ ﴾}

''اے لوگو! تمہارے پاس آگئی ہے نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور (تمہارے) سینوں میں جو

روگ ہیں ان کی شفا اور ہدایت و رحمت اہل ایمان کے حق میں۔ (اے نبی ﷺ !) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت کا مظہر اَتم ہے' پس اس (انعام و احسان) پر خوشیاں مناؤ (کہ اللہ نے قرآن جیسی نعمت تمہیں عنایت فرمائی)۔ جو چیزیں لوگ جمع کرنے (کی کوشش اور فکر) میں لگے رہتے ہیں یہ (قرآن) ان سے کہیں زیادہ قیمتی شے ہے۔''

اس کے علاوہ متعدد مقامات پر یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ میں تمہیداً عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت مجھے 'عظمت قرآن' کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنی۔ میں نے آغاز میں سورۃ البقرہ کی جو آیت مبارکہ تلاوت کی ہے اس میں ماہِ رمضان کا اور روزے کی فرضیت کا ذکر ہے' اس قرآن کے هُدًی لِّلنَّاسِ اور بینہ ہونے کا ذکر ہے' اور حق و باطل اور صحیح و غلط میں فرق و تمیز کرنے والی کتاب ہونے کا ذکر ہے۔ پھر اس آیت مبارکہ کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوا ہے: {وَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾} اس دو لفظی حصّہ میں نزولِ قرآن کا مقصد اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ ''اور تاکہ تم (اس لازوال نعمت پر) اللہ کا شکر ادا کرو''۔ قرآن کا شکر کیا ہے؟ یہ کہ ہم قرآن کی ہدایات' تعلیمات' احکام' اوامر و نواہی کی پیروی کریں اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو ان تمام چیزوں کا پابند بنائیں اور اس پر عمل پیرا ہوں اور اس طرح قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی فکر کریں۔ مجھے آج اسی کے ضمن میں گفتگو کرنی ہے۔

یہ بات بھی جان لیجیے کہ آپ جو روزہ رکھ رہے ہیں' یہ بھی آپ قرآن کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ کے آغاز میں فرمایا: {فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ‌ؕ} پھر قرآن کا تعارف ان الفاظ مبارکہ سے کرا دیا گیا کہ یہ {هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ} ہے۔ پھر حکم دیا گیا کہ {فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ‌ؕ}

قرآن کن لوگوں کے لیے ہدایت ہے؟

اس مقام پر قرآن مجید کو ''هُدًی للنَّاس'' فرمایا گیا ہے کہ یہ ہدایت ہے پوری نوعِ بشر کے لیے' جبکہ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں قرآن کو ''هُدًی لِّلۡمُتَّقِين'' قرار دیا گیا ہے کہ یہ ہدایت ہے خدا ترس لوگوں کے لیے۔ جن میں تقویٰ ہی نہیں' خدا کا خوف ہی نہیں وہ اس کتابِ مبین سے کیا استفادہ کریں گے؟ چنانچہ اس سے ابوجہل' ابولہب اور ولید بن مغیرہ استفادہ نہیں کر سکے' جبکہ قرآن اُن کی اپنی زبان میں نازل ہو رہا تھا اور اُس ہستی (ﷺ) پر نازل ہو رہا تھا جس کی بے داغ سیرت و کردار ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ جسے یہ خود الصادق اور الامین (ﷺ) قرار دے چکے تھے' لیکن پھر بھی محروم کے محروم رہے۔ علّامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

حسنؓ زبصرہ ،بلالؓ از حبش ، صہیبؓ از روم
زِ خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست !

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جن میں خود میلان اور رجحان نہیں ہے اور جن کے دلوں میں راہِ حق کی جستجو اور طلب نہیں ہے، وہ اس 'ھُدًی لِّلنَّاس' سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کتاب سے استفادہ کے لیے تقویٰ، خدا ترسی اور راہِ حق کی طلب کی کوئی نہ کوئی رمق ہونی ضروری ہے۔

اب اس بات کو الجبرا کے فارمولے کی طرح ذہن میں جما لیجیے کہ قرآن اصل میں تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ہے ،لیکن اس سے استفادہ کی شرط تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے کہ اس ماہِ مبارک میں روزہ رکھو جس میں قرآن نازل فرمایا گیا ۔اس ماہ کی برکات سے صحیح طور پر مستفیض ہونے کے لیے دن میں روزہ رکھو۔ اور اس روزے کے ذریعہ سے تقویٰ کی کوئی رمق حاصل ہوئی ہے تو رات کو اللہ کے حضور اس پونجی کو لے کر کھڑے ہو جاؤ کہ اس پر کلامِ الٰہی کی بارش برسے۔ گویا زمین تیار کر لی گئی ہے اور تیار زمین پر بارش برسے تو اس بارش کا فائدہ ہے۔ اگر زمین پر ہل نہیں چلایا،بیج نہیں ڈالا تو بارش آئی اور گئی، اس زمین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم نے اس روزہ کے

ذریعے سے اپنے دل کی زمین کو کچھ تیار کیا ہے، اس میں تقویٰ کی کچھ رمق پیدا کی ہے تو اب قیام اللیل کا اہتمام و التزام کرو، تاکہ بارانِ رحمت کا نزول ہو، یعنی کلامِ الٰہی تمہارے قلب پر نازل ہو۔ بقول علّامہ اقبال ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

جب قرآن انسان کے قلب پر اُترتا ہے تو درحقیقت یہ دل میں جذب ہوتا ہے۔ جس دل میں تقویٰ کا ہل چل چکا ہو تو قرآن اس میں بہار لے آتا ہے۔ اس آیت میں آگے کچھ رعایتیں دی گئی ہیں کہ بیمار ہو یا سفر میں ہو تو تعداد دوسرے دنوں میں پوری کر لو۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔

شکر کا مفہوم

آگے ارشاد ہوا :{وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰکُمۡ}''اور اللہ نے جو ہدایت تمہیں عطا کی ہے اس پر اللہ کی تکبیر کرو''۔{وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ}''اور تاکہ تم شکر کر سکو''۔یَں ''لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ''کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں سمجھنا ہے کہ

''شکر'' کیا ہے ! اگرچہ ہم یہ لفظ بولتے ہیں اور یہ اردو زبان میں عام مستعمل ہے۔ اور لفظ شکریہ تو ہماری زبان پر باربار آتا ہے۔ مہذب انسان کی تو یہ عادتِ ثانیہ ہوتی ہے کہ وہ ہر مہربانی پر شکریہ ادا کرتا ہے ' لہٰذا تہذیبی و تمدنی زندگی میں یہ ''شکریہ'' بہت اہم ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری طرح سمجھا جائے کہ ''شکر'' درحقیقت کسے کہتے ہیں؟ امام راغب اصفہانی ؒ نے اپنی عظیم تصنیف ''مفردات القرآن'' میں قرآن میں استعمال ہونے والے ایک ایک لفظ کے اصل مادہ(root) اور اصل مفہوم پر بحث کی ہے۔ لفظ ''شکر'' پر ان کی بحث بڑی پیاری ہے ۔ انہوں نے فرمایا کہ شکر کے تین درجے ہیں۔ پہلا ہے ''شکر بالقلب'' یعنی پہلے کسی کے احسان کا احساس اور شعور تو ہو۔ اس احسان ' انعام اور نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ تو ہو۔ کسی نے آپ کے ہاتھ پر ہیرا رکھا اور آپ نے اسے محض کانچ کا ایک ٹکڑا سمجھا تو آپ اس کا کیا شکریہ ادا کریں گے ؟آپ کو اس ہیرے کی قدر و قیمت کا

احساس ہی نہیں ہے۔ لہٰذا نعمت کا شکر بقدرِ معرفتِ نعمت ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ کسی نعمت کی قدر وقیمت کا جتنا ادراک و شعور ہو گا ' اتنا ہی آپ اس نعمت کا شکر ادا کر سکیں گے۔ لہٰذا شکر کا پہلا درجہ اور مرحلہ شکر بالقلب ہے۔ دوسرا درجہ اور مرحلہ ہے ''شکر باللسان''---- یعنی دل میں جو جذباتِ شکر اُبھرے ہیں ' اب وہ زبان پر آئیں گے ' الفاظ کا جامہ اختیار کریں گے اور آپ اپنے محسن و منعم کا زبان سے شکریہ ادا کریں گے۔ اور شکر کا تیسرا درجہ اور مرحلہ ہے ''شکر بالجوارح''---- یعنی اپنے پورے وجود سے شکر کرنا۔

یہ شکر کیا ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ''شکر'' دراصل یہ ہے کہ اس نعمت کا حق ادا کیا جائے۔ اگر نعمت کا حق ادا نہیں کیا تو یہ بھی ناشکری ہے۔ میں اس کی تفہیم کے لیے سادہ ترین مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی بچے کو اُس کے والد کوئی اعلیٰ کتاب لا کر تحفے میں دیتے ہیں۔ وہ بچہ مہذب ہے ' کلچرڈ ہے ' وہ فوراً "Thanks daddy"تو کہہ دیتا ہے۔ اس تحفہ پر اباجان کا زبان سے تو شکریہ ادا کرتا ہے ' لیکن پھر اس کتاب کو الماری میں رکھ دیتا ہے ' کھولتا نہیں ' اس کا مطالعہ نہیں کرتا۔ تو بتایئے کہ کیا اُس نے شکر کیا؟ حقیقت میں اُس نے ناقدری اور ناشکری کی ' کفرانِ نعمت کیا۔ باپ نے کتاب اس لیے لا کر دی تھی کہ بچہ پڑھے تو اس کے علم و فہم میں وسعت اور معلومات میں اضافہ ہو ' لیکن اس بچے نے کتاب سے یہی مقصد حاصل نہیں کیا۔ زبان سے تو شکریہ ادا کر دیا ' حقیقت میں اپنے وجود سے شکریہ ادا نہیں کیا۔ گویا نعمت کا حق ادا کرنا آخری درجہ کا شکر ہے۔

اب اس کے حوالے سے سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن جیسی کتاب دی ---- اب دیکھئے میں نے ابھی جو مثال دی ہے اس سے بڑی پیاری مناسبت پیدا ہو گئی۔ جیسے باپ نے بچے کو کتاب لا کر دی ' ایسے ہی ہمارے آسمانی باپ نے ہمارے لیے کتاب اتاری ---- ''آسمانی باپ'' کا لفظ انجیل میں آتا ہے اور اس اعتبار سے غلط نہیں ہے کہ جیسے باپ اولاد کی پرورش کرتا ہے ' ویسے ہی اللہ تعالیٰ آسمانی باپ ہے ' ربّ العالمین ہے ' تمام

جہانوں کا پروردگار اور پالن ہار ہے ---- تو ہمارے پروردگار نے ہمیں کتاب دی اس لیے کہ ہم اس سے ہدایت اخذ کریں' اسے ہم اپنا امام اور راہنما بنائیں' اس سے اپنے سینوں کو

آباد کریں' اس سے ہم اپنے قلوب و اذہان کو روشن کریں'اس کی تعلیمات سے استفادہ کریں۔ اس کتاب سے اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کریں'اُس کی صفاتِ کمال کا ادراک کریں' اُس کی توحید کو پہچانیں' اُس کی مرضیات کا شعور و فہم حاصل کریں' اُس کے اوامر و نواہی سے آگاہ ہوں اور اس پوری کائنات بالخصوص انسان کی تخلیق کے مقصد کو جانیں ---- لیکن اگر ہم نے اس کتاب کو بند کر کے رکھ چھوڑا اور اسے گاہے بگاہے چوم لیا' یا یہ اگر کہیں ہاتھ سے گر گیا تو اس کے ہم وزن گندم صدقہ کر دی' یا بچی کو اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ نسخہ جہیز میں دے دیا' یا یہ کہ بہو جب پہلی بار گھر میں داخل ہو رہی ہے تو اس پر قرآن کا سایہ کر لیا ---- تو کیا قرآن کے یہ حقوق ہیں؟کیا قرآن ہمیں ان کاموں کے لیے دیا گیا تھا؟

دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز

مَیں نے لاہور میں ۱۹۶۶ء کے اواخر میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے بھروسے پر دعوت رجوع اِلی القرآن کا کام شروع کیا اور متعدد علاقوں میں مطالعہ قرآن کے حلقے قائم کیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کو قبولِ عام حاصل ہوا' تو مسجد خضراء سمن آباد کے منتظمین کی طرف سے مجھے اس مسجد میں خطابِ جمعہ کی دعوت ملی ۔اُس زمانہ میں یہ علاقہ کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ میں نے ۱۹۶۸ء کے اوائل سے اس کام کا آغاز کر دیا اوراس مسجد میں پہلے دو جمعوں میں ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے موضوع پر تقریریں کیں ---- اس طرح مسجد خضراء قریباً دس سال تک پورے پاکستان کے لیے دعوت رجوع الی القرآن کا مرکز بنی رہی۔ مجھے اُس وقت اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے اس مسجد کو کیسے قبول فرمایا ! مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ علیہ نے رکھا تھا۔اس مردِ درویش نے ارضِ لاہور میں چالیس برس تک درسِ قرآن دیا اور ارضِ لاہور کی فضا کو قرآن حکیم کی برکات سے مستفیض فرمایا اور قرآنی تعلیمات کی رُوح کو عام کیا ---- اب آپ دیکھئے کہ ان چیزوں میں کس قدر مناسبت ہوتی ہے۔ ظاہر بین نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت نہیں ہوتی ،لیکن جن کی نگاہ حقائق پر اور

باطن پر ہے وہ ان چیزوں کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ جس مسجد کا سنگ بنیاد اُس اللہ کے بندے کے ہاتھوں رکھا گیا تھا جو داعیٔ دعوتِ رجوع الی القرآن تھا ' اس میں جب میں نے خطابِ جمعہ شروع کیا تو اسی موضوع سے کیا کہ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کیا ہیں؟جب کہ اُس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد اُنؒ کے دستِ مبارک سے رکھا گیا تھا۔

اس موضوع پر خطاب کرنے کا اُس وقت میرے ذہن میں خیال کیوں آیا؟ اس کی بھی بظاہر ایک وجہ تھی۔ وہ صدر ایوب کا دورِ حکومت تھا۔ آپ میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں مختلف جشن منائے جانے کا رواج شروع ہوا تھا۔ جیسے جشن خیبر' جشن مہران وغیرہ' جو دراصل ثقافت کے نام پر بے حیائی کے فروغ کے لیے محافل رقص و سرود کا مختلف عنوانوں سے انعقاد تھا۔ انہوں نے اپنے آخری دور میں مذہبی اور دینی مزاج کے لوگوں کو رشوت بھی دی تھی کہ ''جشن نزولِ قرآن'' بھی سرکاری سطح پر منالیا جائے۔یعنی ہمیں ثقافت کے نام پر اپنی من مانی کرنے دو' تم اپنے ذوق کی تسکین کے لیے قراء ت کی محافل منعقد کرلیا کرو' سرکاری سطح پر سونے کے تاروں سے چالیس من وزنی قرآن مجید تیار کرا لو' نزولِ قرآن کا جشن منا لو' تاکہ دینی و مذہبی ذہن کے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ ہمیں بھی کچھ دیا گیا ہے ۔ اس تناظر میں اُس وقت مَیں نے کہا تھا کہ کیا قرآن مجید کے حقوق یہ ہیں؟کیا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سونے کے تاروں سے قرآن مجید لکھا تھا؟ صحابہ کرامؓ نے تو اس قرآن کو اپنے سینوں میں جذب کیا تھا'اسے اپنی سیرتوں کا جزو بنایا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو اُن راستوں پر چلے تھے جو قرآن نے ان پر واضح کیے تھے۔ اُن میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس کے پاس پورا قرآن مجید کتاب کی شکل میں موجود ہو۔اُس دَور میں طباعت و اشاعت کے لوازمات کہاں تھے ! کہاں تھے یہ آرٹ پیپر! (کاغذ ہی دستیاب نہیں تھا' آرٹ پیپر کا کیا سوال !) اور کہاں تھیں یہ روپہلی وسنہری خوشنما جلدیں ! لیکن قرآن اُن کے دلوں پر نقش تھا' اُنؓ کی شخصیتوں کا جزوِلاینفک بن چکا تھا اور اُنؓ کے پورے وجودمیں سرایت کر چکا تھا۔ یہ تھا قرآن کا حق جو انہوں نے

ادا کیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کسی کے پاس ہڈی پر لکھی ہوئی چند سورتیں تھیں۔ اونٹ کے شانے کی ہڈی چوڑی بھی ہوتی ہے اور ہموار بھی۔ اس پر لکھتے تھے یا جھلیوں پر لکھتے تھے یا کسی کو کاغذ میسّر آگیا تو اس پر چند سورتیں لکھی ہوئی تھیں---- لیکن اس قرآن نے دنیا کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس قرآن نے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا ۔ وہ ہمہ گیر انقلاب کہ آج بھی جب اس کی یاد تازہ کی جاتی ہے تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ بیس برس کے مختصر ترین عرصہ میں آج سے چودہ سو سال قبل اتنا عظیم و ہمہ گیر انقلاب ! !

قرآن مجید کے پانچ حقوق

مَیں اختصار کے ساتھ عرض کروں گا کہ ہر مسلمان کے ذِمّہ قرآن مجید کے پانچ حقوق ہیں۔ اگرچہ معاملہ بقدرِ استطاعت اور بقدرِ صلاحیت و استعداد ہوگا: {لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا ط}(البقرۃ:۲۸۶)''اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اُس کی وسعت کے مطابق ہی ذِمّہ دار اور مکلّف ٹھہراتا ہے۔ '' تاہم یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے کہ ہم حصولِ دُنیا کے لیے تو خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اس تگ و دو میں ہماری استعداد و استطاعت اور اہلیت و صلاحیت کا بھرپور اور نتیجہ خیز مظاہرہ ہوتا ہے' لیکن دین کے لیے ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ذرا غور کیجیے اور انصاف فرمایئے کہ اگر صلاحیت و اہلیت نہیں ہے تو دُنیوی کاموں میں کیسے ظاہر ہو رہی ہے ! تمہارے کاروبار چمک رہے ہیں' تم اپنے پروفیشن میں نام پیدا کر رہے ہو۔ تم میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ایک نہیں' دو دو تین تین مضامین میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے' لیکن ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ عربی سیکھتے اور براہِ راست قرآن پڑھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ایسے لوگوں کا عدمِ صلاحیت و اہلیت کا عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہو گا۔ ہاں واقعتاً کسی میں استعداد نہ ہو' وہ پیدائشی غبی اور کند ذہن ہو' یا بیچارا حالات کی وجہ سے اَن پڑھ رہ گیا ہو تو ایسے لوگوں سے ان ہی اعتبارات سے مواخذہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ میں صلاحیت و استعداد موجود ہے اور آپ نے اس کا رخ کسی اور

طرف موڑ دیا ہے تو اس کی ذِمّہ داری آپ پر ہے۔ تاہم اصولاً یہی کہا جائے گا کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن مجید کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں۔

مَیں نے یہ حقوق قرآن و سُنّت سے ماخوذ کیے ہیں' اور وہ یہ ہیں:

* سب سے پہلا یہ کہ اسے مانو' جیسا کہ اسے ماننے کا حق ہے۔
* دوسرا یہ کہ اسے پڑھو' جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔
* تیسرا یہ کہ اسے سمجھو' جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔

* چوتھا یہ کہ اس پر عمل کرو ‘جیسا کہ عمل کا حق ہے ۔

* اور پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچائو‘ جیسے اسے پہنچانے کا حق ہے ۔ اس لیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے تمہارا یہ فرضِ منصبی ہے۔

یہ پانچ حقوق ہیں جن کو میں نے نہایت سادہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اب میں ان میں سے ہر ایک کی اختصار کے ساتھ وضاحت کروں گا۔ ویسے بحمدِ اللہ اس موضوع پر میرا کتابچہ موجود ہے۔ جن حضرات کے دلوں میں قدرے تفصیل جاننے کا اشتیاق پیدا ہو‘ ان سے میں گزارش کروں گا کہ وہ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا حق : اس پر ایمان لائو !

مَیں نے قرآن مجید کے یہ جو پانچ حقوق بیان کیے ہیں‘ ان میں سے ہر ایک کے لیے قرآن مجید اور سُنّت رسول علی صاحبھا الصلوۃ والسلام کی اصطلاحات ہیں ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے درجات ہیں ۔ ماننے کی اصطلاح کیا ہے؟ ایمان ! اب اس ایمان یعنی ماننے کے بہت سے درجے ہیں۔ کہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان اور کہاں ہم میں سے کسی کا ایمان ! ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک ! -------حالانکہ ہے تو ایمان ہی ‘لیکن درجے مختلف ہیں۔ البتہ ایمان کے دو درجے سمجھنے بہت ضروری ہیں۔ ایک ماننا ہے قانونی درجہ میں کہ ہم نے زبان سے اقرار کر لیا کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔جب کہ ایک ماننا ہے دل کی گہرائی سے‘ جس سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ یہ واقعتاً اللہ کا کلام ہے۔ اصل میں یہ ماننا اور یہ ایمان مطلوب ہے۔ اقرارٌ بِاللِّسان تو ہمیں خود بخود حاصل ہوگیا‘کیونکہ ہم مسلمانوں میں پیدا ہوگئے۔ لہٰذا ہم زبان سے مانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

لیکن اس ماننے سے نہ اس کی طرف ہمارا التفات ہے‘ نہ توجّہ ہے‘ نہ ہم اسے پڑھتے ہیں اور نہ ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا کیا سوال ! بس ایک کتابِ مقدّس کے طور پر اسے مان لیا ہے۔ لیکن جب آپ دل کی گہرائی سے اور تصدیق بالقلب کی کیفیت سے مانیں گے کہ یہ واقعی اللہ کا کلام ہے تو پھر آپ کے دل میں اس کی عظمت پیدا ہو گی اور اس کی قدرو منزلت اور اہمیت کا شعور حاصل ہو گا۔ اس تصدیق قلبی کے بغیر اگلا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ اگر آپ کو اس کے کلام اللہ ہونے پر یقین قلبی ہی حاصل نہیں ہے تو آپ کاہے کو اسے پڑھنے پر وقت لگائیں گے ! اس کو سمجھنے پر کاہے کو اپنی صلاحیتیں کھپائیں گے ! کاہے کو آپ اس پر عمل کا کھکیڑ مول لیں گے اور کاہے کو دوسروں تک پہنچانے کی ذِمّہ داری سنبھالیں گے ! لہٰذا سب سے پہلے تو یقین کی ضرورت ہے۔ بقول علّامہ اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری !

اب یہاں ایک عملی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقین کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب مَیں نے اپنے کتابچہ میں دیا ہے' لہٰذا جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ اس کا مطالعہ ضرور کرلیں۔

دوسرا حق: اس کی تلاوت کرو

اب آیئے دوسرے حق کی طرف ۔ ''اسے پڑھو جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے''۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: {اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ} (البقرۃ:۱۲۱) ''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے''۔ اس کا کیا مفہوم ہے! حق تلاوت کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ کہ قرآن مجید کے حروف کے مخارج صحیح ادا ہو رہے ہوں۔ اس کا نام تجوید ہے۔ کبھی یہ ہماری تعلیم کا نقطۂ آغاز ہوا کرتا تھا۔ ہر مسلمان بچہ سب سے پہلے 'نورانی قاعدہ' یا 'یسرنا القرآن' پڑھا کرتا تھا۔ ان کے ذریعے سے اسے قرآن کے حروف کی شناخت اور ان کے مخارج کا صحیح علم اور ساتھ ہی قرآن مجید کے رموزِ اوقاف کا صحیح علم حاصل ہوتا تھا۔ ان سب

کو سمجھ کر قرآن کو پڑھنا --------یہ پہلا اور ابتدائی حق ہے۔

پھر یہ کہ اس کا جتنا زیادہ سے زیادہ حصّہ یاد کیا جاسکتا ہے اسے یاد کیا جائے۔ حفظِ قرآن کا الحمد للہ ہمارے یہاں پھر چرچا ہوا ہے اور اکثر لوگ اپنے کسی نہ کسی بچے کو بچپن میں ضرور حفظ کرا دیتے ہیں' بہت سے کھاتے پیتے گھرانوں میں بھی یہ روایت پڑ گئی ہے ۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ تقسیم کے وقت جو شہر ہندوستان میں رہ گئے ہیں ان میں سے پانی پت' ٹونک' سہارن پور اور بہت سے دوسرے شہر ایسے تھے جن میں یہ خصوصی روایت تھی کہ ہر خاندان کم از کم ایک بچے کو ضرور حفظ کراتا تھا۔ جیسے انڈونیشیا میں ماضی قریب تک یہ روایت قائم رہی ہے کہ شادی کے فوراً بعد نوبیاہتا جوڑے حج کے لیے جاتے تھے۔ حج کے لیے بہترین عمر یہی جوانی کی عمر ہے اور پھر ابھی بال بچے بھی نہیں ہیں کہ جن میں دل پڑا رہے اور دورانِ حج میں وہ یکسوئی حاصل نہ ہو سکے جو مطلوب ہے۔ بہرحال ہمارے یہاں بھی تقسیم سے قبل یہ روایت رہی ہے کہ قریباً ہر خاندان میں ایک حافظ ہوتا تھا' اور اُس گھر کو منحوس سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی حافظ نہ ہو۔ اگرچہ اب یہ صورت حال تو باقی نہیں رہی 'تاہم بفضلہ تعالیٰ چند برسوں سے بعض مخلص حضرات اور اداروں کی کوششوں سے حفظ قرآن کا کافی چرچا ہے۔ لیکن مَیں دوسرے حفظ کی بات کر رہا ہوں کہ ہر مسلمان یہ سمجھے کہ میرا اصل سرمایہ وہ قرآن ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے۔ ایک پارہ ہو' دو تین ہوں یا اس سے زیادہ ہوں' ان کی حفاظت کرتا رہے اور مزید اضافے کے لیے کوشاں رہے۔ اس حفظِ قرآن سے کوئی مسلمان محروم نہ رہے ۔ مجھے بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ بات عرض کرنی پڑ رہی ہے کہ

ہماری مساجد کے اکثر و بیشتر ائمہ حضرات کا حال یہ ہے کہ قرآن کے چند مقامات اور گنتی کی سورتوں کے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔ جہری نمازوں میں انہی کو بار بار دہرا لیا جاتا ہے ۔الا ماشاء اللہ ! صاحب ذوق لوگ بھی ہیں ‘لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس اعتبار سے یہ بڑی محرومی ہے کہ قرآن کے حفظ میں اضافہ کے ذوق میں حد درجہ کمی ہو چکی ہے۔

تلاوتِ قرآن کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اسے اچھی سے اچھی آواز اور زیادہ سے زیادہ

خوش الحانی سے پڑھا جائے۔حضرت براءبن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((زَیِّنُوا الْقُرآنَ بِاَصْوَاتِکُمْ))(رواہ احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی)’’قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو‘‘۔ اس معاملہ میں کوتاہی پر تنبیہہ بھی فرمائی: ((لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرآنِ))(رواہ البخاری)’’جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں !‘‘

پھر اس کے آداب ہیں۔ تلاوت کے لیے باوضو ‘دوزانو ہو کر قبلہ رخ بیٹھیں۔ مصحف کا ادب اور اس کی تعظیم کیجیے۔ تلاوت کی ابتدا تعوذ سے کیجیے --------البتہ ان آداب کے ضمن میں یہ بات جان لیجیے کہ جب تلاوت حصولِ ثواب یا تذکر کی نیت سے کی جا رہی ہو تو ان آداب میں سے کسی میں بھی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر تعلیم و تعلم یا درس و تدریس کے لیے قرآن پڑھا جائے‘ مثال کے طور پر جو بچے ناظرہ پڑھ رہے ہوں یا حفظ کر رہے ہوں‘ ان کو علماء کرام نے ان پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

مزید یہ کہ تلاوت کا معمول ہونا چاہیے۔ اللہ توفیق دے تو روزانہ زیادہ سے زیادہ حصّہ کی تلاوت کریں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین روزانہ قرآن کی ایک منزل تلاوت کر کے سات دن میں ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ جب کچھ عرصہ گزرگیا اور ہمارے ذوق و شوق اور جوش و جذبے میں کمی آگئی تو قرآن مجید کو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا کہ چلیے روزانہ ایک پارہ پڑھ کر ہر مہینہ میں قرآن ختم کر لیا جائے۔ماضی قریب میں ہمارے یہاں کثرت سے اس کا معمول تھا۔ مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ اکثر مسلمان یہ کوشش کرتے تھے کہ ایک پارہ کی روزانہ تلاوت کرلیں۔ لیکن آج کل اگر آپ کی روزانہ کی مصروفیات میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ آپ روزانہ ایک پارے کی تلاوت کے لیے بھی وقت نہیں نکال پاتے تو بر سبیلِ تنزل آپ پون پارہ پڑھیے‘ نصف پڑھیے‘ پاؤ پڑھیے‘ ایک رکوع ہی پڑھ لیجیے ‘لیکن اس کو زندگی کا معمول بنائیے۔ آپ کا کوئی دن تلاوتِ قرآن سے محروم نہ رہے ------یہ تمام چیزیں ’’یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ‘‘ میں شامل ہیں۔

تیسرا حق: اسے سمجھو اور اس پر غور وفکر کرو!

اب آیئے تیسرے حق کی طرف: ''قرآن کو سمجھو' جیسا کہ اسے سمجھنے کا حق ہے''۔ اس سمجھنے کے بھی دو درجے خاص طور پر قرآن مجید سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک سمجھنا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کہتے ہیں: ''تذکر بالقرآن'' یعنی قرآن سے ہدایت و نصیحت حاصل کر لینا۔ اور ایک درجہ ہے: ''تدبر قرآن'' یعنی قرآن پر غور کرنا۔ اب سمجھئے کہ غور کسے کہتے ہیں! یہ لفظ غار سے بنا ہے۔ عربی میں غار کہتے ہیں زمین میں بہت گہرے گڑھے کو۔ غور کرنے سے مراد ہو گا کہ قرآن کی گہرائیوں میں اترا جائے۔ علّامہ اقبال نے اسے یوں تعبیر کیا کہ ع

''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!''

------یہ قرآن علم و عرفان کا اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اس میں غوطے لگائو' اس کے علوم و عرفان' اس کے معارف و معانی اور حقائق و مفاہیم کے موتی وجواہر کی جستجو کرو اور ان کو نکال کر لائو۔

تذکر کے لیے قرآن بہت آسان ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ القمر میں اللہ تعالیٰ نے چیلنج کے انداز میں چار مرتبہ فرمایا: {وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۱۷﴾} (آیات ۱۷'۲۲'۳۲'۴۰) یعنی ''ہم نے ذکر کے لیے' نصیحت و یاد دہانی کے لیے' اور ہدایت اخذ کرنے کے لیے قرآن کو آسان بنا دیا ہے' تو ہے کوئی اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے والا اور اس سے نصیحت اخذ کرنے والا!''------اس تذکر بالقرآن کے لیے صرف ایک چیز ضروری ہے' وہ یہ کہ اتنی عربی آپ کو آنی چاہیے کہ جب آپ قرآن پڑھیں تو اس کا ایک سادہ سا مفہوم روانی کے ساتھ آپ کے قلب پر اترتا اور اسے منور کرتا چلا جائے------ اس لیے کہ جب آپ ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور نتیجتاً اصل تاثیر نہیں رہتی' اگرچہ علم تو حاصل ہوتا ہے۔ علم کا تعلق ذہن سے ہے اور تأثر کا قلب سے۔ قرآن کا جو اثر انسان کے جذبات پر پڑنا چاہیے' ترجمہ اور حواشی کی طرف بار بار رجوع کرنے سے اس تاثر کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ قرآن کی تاثیر سے جذبات میں جو ارتعاش برپا ہونا چاہیے اور قرآن کو آپ کے باطن کی گہرائیوں میں اتر کر آپ کے

قلب کے تاروں کو جو چھیڑنا چاہیے تو وہ تار نہیں چھڑتے------یہ ضرور ہے کہ ترجمہ اور حواشی کی مدد سے قرآن پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تھوڑی بہت عربی آتی ہو اور تسلسل کے ساتھ تلاوت ہو تو اس کی اپنی تاثیر ہے۔ البتہ کوئی اشکال محسوس ہو یا کوئی ثقیل یا نامانوس لفظ آجائے تو ترجمہ اور حواشی کی طرف رجوع کرنا

مفید ہوتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجیے کہ قرآن مجید نہایت سلیس اور سادہ زبان میں ہے۔ یہ عربی مبین ہے' یعنی روشن عربی۔ بلکہ اسے ادب کی اصطلاح میں ''سہلِ ممتنع'' کہنا درست ہو گا کہ انتہائی آسان الفاظ ہیں' انتہائی اعلیٰ مضامین و مفاہیم ادا کیے جائیں۔ لہٰذا میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ تذکر بالقرآن کے لیے عربی کی اس قدر تحصیل ضروری ہے کہ قاری قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ سمجھ سکے۔ اسے مشکل نہ سمجھئے۔ عربی زبان کو خواہ مخواہ 'ہوا' بنا دیا گیا ہے جبکہ یہ بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ اسے بہت جلد سیکھ سکتے ہیں جنہوں نے بی اے اور ایم اے کیا ہو یا ڈاکٹر اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کیے ہوں۔ لیکن اس کے لیے لگن اور ضرورت کا شدید احساس ناگزیر ہے۔ مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں اور تجربات کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ تذکیر' نصیحت اور یاد دہانی حاصل کرنے کے لیے اس شخص کے لیے قرآن بڑی سادہ کتاب ہے' جس نے عربی زبان کی صرف و نحو کے چند بنیادی اصول سیکھ لیے ہوں اور ان کی تمیز حاصل کر لی ہو۔ اس لیے کہ قرآن کا اصل موضوع اور اساسی مضامین فطرتِ انسانی کے جانے پہچانے ہیں اور قرآن کو بامعنی پڑھتے ہوئے ایک سلیم الفطرت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے باطن میں مستور بدیہیات سے واقف ہو رہا ہے اور اپنی فطرت کی آواز کو دل کے کانوں سے سن رہا ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کا طرزِ استدلال منطقی نہیں ہے۔ وہ آفاق و انفس کی نشانیوں سے انسان کو جگاتا اور اُسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ پھر یہ کہ مشکل مضامین کو نہایت سادہ اور دل نشین مثالوں کے ذریعے سے آسان بنا کر قلب پر اثر ڈالتا ہے۔ اس پر نُوْرٌ عَلٰی نُوْر قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور سلاست کی وہ معراج ہے جس کے سامنے عرب کے نامی گرامی شعراء' خطباء اور ادباء سرنگوں ہو گئے تھے اور

انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

البتہ ''تدبر قرآن'' وہ شے ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ سے ایک طویل حدیث میں قرآن حکیم کے بارے میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَاءُ)) ''اور اہلِ علم اس (کتاب) سے کبھی سیر نہ ہو سکیں گے''۔ اور ((وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہُ)) (رواہ الترمذی) ''اور نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی واقع ہو گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف کے خزانے) کبھی ختم ہو سکیں گے''۔ علماءِ حقانی اس قرآن پر غور و تدبر کرتے رہیں گے' اس کام میں ساری ساری عمریں لگا دیں گے۔ کتنے ہی امام رازیؒ' امام زمخشریؒ اور ان کے پائے کے بے شمار مفسرین قرآن آئیں گے جو یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوں گے کہ ع 'حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''۔ قرآن مجید میں کتنے ہی مقامات ایسے آئیں گے کہ بڑے بڑے فضلاء' علماء اور مفکرین گھٹنے ٹیک دیں گے

اور یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ : اِعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِیْقٌ مُھِیْبٌ ''ہوشیار ہو جائو کہ یہ مقام بہت مشکل ہے' بہت گہرا ہے' بہت غامض ہے' بہت پُرہیبت ہے''۔ امام رازیؒ کو یہ کہنا پڑ رہا ہے تو 'تابہ دیگراں چہ رسد!'

اس کی ایک مثال مَیں نے اپنے کتابچے میں دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''مَیں نے صرف سورۃ البقرۃ پر آٹھ سال تک تدبر کیا ہے''۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ انہیں نہ عربی سیکھنی تھی اور نہ صرف و نحو پڑھنے کی ضرورت تھی۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور زبان کی خطابت اور زبان دانی کا چرچا تھا اور انہیں شانِ نزول کی روایات کی چھان بین کرنے کی بھی کوئی احتیاج نہیں تھی۔ وہ تو خود اُس ماحول میں رہ رہے تھے جس میں قرآن نازل ہو رہا تھا۔ حضور ﷺ سے نہایت قرب رکھتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر فقیہہ الامّت کے فرزند ہیں۔ لیکن صرف سورۃ البقرۃ پر تدبر اور غور وفکر میں آٹھ سال لگائے ہیں۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ پورا قرآن سورۃ البقرۃ سے

بارہ تیرہ گنا ہے' تو کسی کی سوا سو برس کی عمر ہو تو شاید وہ اس طریقے سے قرآن پر قابل لحاظ حد تک تدبر کر سکے۔ البتہ اتنی عمر صرف کر کے بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیںنے قرآن کے معانی آخری حد تک جان لیے ہیں اور مَیں نے اس کی تہہ تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ لیکن بایں ہمہ قرآن کریم نے اپنے محل تدبر ہونے کو بایں الفاظ مبارکہ خود واضح کیا ہے:{کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿ ۲۹ ﴾}(صٓ)''یہ قرآن ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے (اے نبی ﷺ !) آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر (و تفکر) کریں اور تاکہ ہوش مند لوگ نصیحت حاصل کریں''------آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دونوں اصطلاحات آگئیں' یعنی تدبر قرآن اور تذکر بالقرآن' جن کا میری گفتگو کے اس حصّہ سے تعلق ہے۔

پھر قرآن پر عدم تدبر کا گلہ ان الفاظ میں خود قرآن میں موجود ہے :{اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط} (النساء:۸۲)''کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟''پھر یہی شکوہ سورۂ محمدؐ میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے :{اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا ﴿ ۲۴ ﴾} ''کیا یہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے ؟ یا دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟''---- قرآن حکیم پر تدبر اور غور و فکر کا حقیقی تقاضا ہے کہ اس کام کے لیے لوگ اپنی زندگیاں لگا دیں' کھپا دیں۔ یہ اتنا عظیم ترین کام ہے کہ اس کو ظاہر فرمانے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ))

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔''

یعنی قرآن کی تعلیم و تعلّم کو اپنی زندگی کا اوّلین مقصد بنا لو' اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرو' اس کو اپنا کیریئر بنا لو۔ اس سے اعلیٰ کام کوئی نہیں۔ یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور اس کے راوی خلیفۂ راشد ذوالنورین

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں ‘جن کی مظلومانہ شہادت سے عرشِ الٰہی تھرا اُٹھا تھا۔ پس نوٹ کرلیجیے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے دو درجے ہوگئے۔ ایک تذکر بالقرآن اور دوسرا تدبر قرآن۔

چوتھا حق: اس پر عمل کرو

اب آیئے چوتھے حق کی طرف : ''قرآن پر عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے''۔ ظاہر بات ہے کہ عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں ! بلکہ وہ علم سخت ترین باز پرس کا باعث بن جائے گا جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ ایسا علم کسی درجہ میں بھی نفع کا ذریعہ بننے کے بجائے الٹا نقصان کا موجب بن جائے گا۔ اس لیے کہ علم کے مطابق عمل ہونا لازم ہے (۱)۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَہٗ)) (سنن الترمذی) ''جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرالے وہ قرآن پر ایمان ہی نہیں رکھتا ''-------گویا وہ جھوٹ بولتا ہے کہ میرا قرآن پر ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن خود دوٹوک فیصلہ سناتا ہے :{وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ... فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ ...فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾} (المائدۃ)''اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں ...تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں ...تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو اللہ کی نازل کردہ کتاب ‘ شریعت اور قوانین و ضوابط کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ‘تین بڑے جرائم کا مرتکب قرار دیا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ کافر ہیں۔ ان کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ اگر یہاں ظلم کے لغوی معنی مراد لیے جائیں تو ان کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اللہ کے احکام عدل و قسط پر مبنی ہوتے ہیں ‘لہٰذا اس سے ہٹ کر ہر فیصلہ ظلم

---

(۱) ''الاتقان فی علوم القرآن'' کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ''مبادیٔ تدبر قرآن'' میں روایت نقل کی ہے کہ ''ابوعبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھتے پڑھاتے تھے ‘جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان اور عبداللہؓ بن مسعود وغیرہ کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی اکرم ﷺ سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کرلیتے تو آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورۃ کے حفظ میں وہ برسوں لگا دیتے تھے۔''

قرار پائے گا۔ اور یہ ایک نوع کا شرک ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ فسق کے معنی ہیں اپنی جائز حدود سے تجاوز کرنا' مراد ہے اللہ کی نافرمانی کرنا -------ان آیات کے سیاق میں قرآن سے پہلے نازل کردہ دو کتبِ الٰہی تورات و انجیل کا ذکر ہے' جب کہ آیت ۴۷ کے متصلاً بعد آیت ۴۸ میں نزولِ قرآن کا ذکر ہے :{وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ}''اور (اے نبی ﷺ) اب ہم نے آپ پر بھی کتابِ برحق نازل کی ہے (یعنی قرآن مجید) جو اُن کتابوں کی جو پہلے سے موجود ہیں تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ بھی ہے' پس جو کچھ اللہ نے آپ پر نازل کیا ہے' آپ اُسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور جو حق آپ کے پاس آچکا ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔''

سورۃ المائدۃ میں یہ بات باعادہ و تکرار فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے وہ اس لیے نازل فرمایا ہے کہ اس کے مطابق فیصلے کرو۔ قرآن اس لیے نازل فرمایا کہ اس پر مبنی نظام قائم کرو' اس کے مطابق اپنے تمام جھگڑے نمٹاؤ۔ شریعت اس لیے نازل فرمائی کہ اس پر عمل پیرا ہو۔ اگر انفرادی و اجتماعی معاملات میں قرآن پر عمل نہیں اور نہ عمل کا ارادہ ہے تو قرآن کو اللہ کی کتاب ماننا' اس کی تلاوت کرنا اور اسے سمجھنا بے کار ہو جائے گا۔ میری اس بات کو نبی اکرم ﷺ کے دو اقوال مبارک سے سمجھیے۔ پہلا قول ہے : ((اَلْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ)) (صحیح مسلم) ''قرآن یا تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف حُجّت بنے گا''۔ یعنی اگر تمہارا عمل اس کے مطابق ہو گا تو تمہارا شفیع بنے گا' بصورت دیگر تمہارے خلاف مستغیث بن کر کھڑا ہو گا اور دعوے دار ہوگا کہ اے اللہ ! یہ شخص مجھ پر ایمان رکھنے کا مدّعی تھا' میری تلاوت کرتا تھا' مجھے سمجھنے کے لیے وقت صرف کرتا تھا' لیکن اس نے میری ہدایات و تعلیمات پر نہ عمل کیا اور نہ عمل کرنے کا عزم و ارادہ کیا۔

دوسرا قول مبارک ہے : ((اَکْثَرُ مُنَافِقِیْ اُمَّتِیْ قُرَّاءُھَا)) (مسند احمد)

''میری اُمّت کے منافقین کی بڑی تعداد قراء پر مشتمل ہو گی''۔یہاں قاری سے مراد عالم ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جو قاری ہوتا تھا وہی عالم بھی ہوتا تھا۔ ہمارے یہاں اس وقت جو تقسیم نظر آتی ہے کہ قاری اور ہے' عالم اور ہے' جو تجوید جانتا ہو اور قرآن کی خوش الحانی سے قراء ت کرتا ہو' وہ ہمارے نزدیک قاری ہے' چاہے وہ عربی بالکل نہ جانتا ہو' وہاں اس کا تصوّر ہی نہیں تھا۔ عالم ہی کو قاری کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمّت کے منافقین میں اکثریت قراء یعنی علماء کی ہو گی۔ ایسا کیوں ہو گا؟اس لیے کہ سب سے زیادہ علم ان کے پاس ہو گا اور اگر علم کے مطابق عمل نہ ہو اتو{لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾} (الصَّف)کی زد میں سب سے پہلے وہی آئیں گے۔ جس بے چارے کا علم تھوڑا ہے اور اُس نے اس کے مطابق عمل کر لیا تو وہ اللہ کے یہاں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن جو

علم کے لحاظ سے کوہِ ہمالیہ ہے لیکن عمل کے اعتبار سے کچھ نہیں تو وہ یقیناً حضور ﷺ کے اس قول کی زد میں آ رہا ہے کہ ((اَکْثَرُ مُنَافِقِیْ اُمَّتِیْ قُرَّاءُھَا)) ------- اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ لہٰذا سلامتی کی راہ ایک ہی ہے کہ قرآن کا جتنا بھی علم حاصل ہو اس پر حتی الامکان فوری طور پر عمل شروع کر دیا جائے۔

لیکن اس عمل کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک انفرادی عمل کا دائرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو! یہ آپ پڑھ سکتے ہیں' یہ تو انگریز کے دورِ استعمار میں بھی پڑھی جاتی تھی اور اس حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی' جو چاہے پڑھ سکتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ماہِ رمضان کے روزے رکھو! آپ رکھ سکتے ہیں' امریکہ میں ہوں' ہندوستان میں ہوں' خالص اور کٹر کافروں میں ہوں' تب بھی رکھ سکتے ہیں' کوئی پابندی نہیں' یہ آپ کا ذاتی فعل ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا' نبی اکرم ﷺ نے اس کا نصاب اور مقادیر مقرر فرما دیں' آپ آج بھی اسے ہر قسم کے ماحول میں ادا کر سکتے ہیں' کوئی قانون اس راہ میں حائل نہیں ہو گا۔ اب میری بات غور سے سماعت فرمایئے۔ احکامِ شریعت کا ایک دائرہ ہر مسلمان کے انفرادی عمل اور اس کی نجی زندگی سے متعلق ہے۔ اس انفرادی عمل کے لیے ہر مسلمان ہر وقت اور ہر آن مکلّف ہے۔

اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ فسق ہے' نافرمانی ہے' عصیان و عدوان ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا ماحول ٹھیک نہیں تھا' یا ہمارے یہاں اسلامی نظام قائم نہیں تھا' اس لیے وہ بے عمل رہا۔ اگرچہ نظام قائم نہیں' لیکن آپ نماز تو پڑھ سکتے ہیں' جہاں مسجدیں نہیں وہاں گھر میں پڑھ سکتے ہیں۔ مسلمان معاشرہ موجود نہیں' لیکن بہرحال روزہ تو تمہیں رکھنا ہے۔ اگر تم صاحب نصاب ہو تو معاشرے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستحقین تک زکوٰۃ تو پہنچا سکتے ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کی پابندی کرنا تو تمہارا ذاتی فعل ہے کہ تم حرام کھاتے ہو یا اس سے اجتناب کرتے ہو۔ عورتوں کو اُن کا حق وراثت ادا کرتے ہو یا رواج کے نام پر اور غیر مسلموں کی تقلید میں اللہ کے قانونِ وراثت کو پامال کرتے ہو۔ اسی طرح تم داڑھی رکھتے ہو یا نہیں رکھتے۔ یا تو تم نے داڑھی کو نبی اکرم ﷺ کی سُنّت نہیں سمجھا اور بہت بڑے دھوکہ میں رہے' یا تم نے یہ سمجھا کہ سُنّت پر عمل ضروری نہیں ہے۔ یہ خالصتاً تمہارے ذاتی معاملات ہیں' ان کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔ دین کا جو یہ حصّہ ہے تو اس میں کسی رعایت کا سوال ہی نہیں ہے۔

اسی انفرادی عمل کے دائرے میں ایک نہایت اہم معاملہ اور آتا ہے جس سے ہم روز بروز نہ صرف غفلت برت رہے ہیں بلکہ نہایت ڈھٹائی کا وطیرہ اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں' اور وہ ہے ستر و حجاب یعنی پردے کا مسئلہ -------- اور تمام تمدنی طور طریقوں میں مساواتِ مرد و زن اور ہر میدان میں عورتوں کا مَردوں کے شانہ بشانہ حصّہ لینے کا مکروہ ہی نہیں' قرآنی احکام اور سُنّت کے خلاف طرزِ عمل ---------اگر اللہ نے پردے کا حکم دیا

ہے ' ستر و حجاب کے احکام نازل کیے ہیں' اور مرد و عورت کے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کا تعین فرمایا ہے تو تا حال کوئی ایسا آرڈیننس آپ پر نافذ نہیں ہوا کہ آپ کو قانوناً اِن اوامر

ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے پردے کے خلاف آرڈیننس جاری کر دیا تھا اور برقعہ یا چادر اوڑھنا ممنوع قرار دے دیا تھا 'لیکن قریباً پچاس سال کی تاریخ گواہ ہے کہ ترکوں نے مِن حیث القوم اسے تسلیم نہیں کیا ۔ اس حکم کی اُس وقت سے تا حال مخالفت و مزاحمت اور مقاومت جاری ہے'جبکہ آج بھی وہاں ان لڑکیوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکالا جا رہا ہے جو چہروں پر نقاب ڈال کر آتی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی اول و دوم نے بھی ایران میں آرڈی ننس کے ذریعہ سے پردہ اور ستر و حجاب کے قوانین شریعت کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خود ختم ہو گئے اور اب ایران میں پردہ اور ستر و حجاب کا جس قدر اہتمام ہے شاید ہی کسی دوسری مسلمان مملکت میں ہو۔ لیکن یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے کہ یہاں ستر و حجاب کے اسلامی قوانین آپ کے گھروں میں پامال ہو رہے ہیں۔ اس کی پوری ذِمّہ داری آپ پر ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ سے اس بارے میں بڑی سخت باز پرس ہو گی۔ اس لیے کہ یہاں ایسا کوئی آرڈیننس موجود نہیں ہے کہ خواتین برقعے اتار دیں ' بے حجابانہ سڑکوں پر' مارکیٹوں میں' تفریح گاہوں میں مٹر گشت کریں۔ یہ لعنت ہم نے خود اپنے اوپر مسلط کی ہے۔ حال یہ ہو گیا ہے کہ جس کے پاس چار پیسے ہو گئے اس کے گھر کی خواتین نے برقعہ اتار پھینکا۔ گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ برقعے کی ''لعنت'' صرف غریب کے لیے ہے۔ یہ ہم نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کیا ہے۔ جس کو مالی حیثیت سے آسودگی حاصل ہوئی' اس نے پہلا کام یہ کیا کہ پردے اور ستر و حجاب کے شرعی احکام کو پائوں تلے روند ڈالا۔

اسی لیے میں کہا کرتا ہوں اور یہ بات بہت سوں کو بڑی ناگوار گزرتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں' لیکن ہم دنیا کے مہاجر تھے' دین کے مہاجر نہیں تھے۔ اگر خالصتاً دین کے لیے ہجرت کی ہوتی تو یہ نقشے نظر نہ آتے کہ وہ گھرانے جن کی عورتوں کی حفیظ جالندھری کے اس مصرع کے مصداق یہ کیفیت تھی کہ ع ''چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی ان کی جھلک !'' جن کا دستور یہ تھا کہ اول تو باپردہ ڈولیوں میں آنے جانے کا التزام تھا 'لیکن اگر تانگوں میں بیٹھنا ہو تو نہ صرف یہ کہ برقعوں سمیت بیٹھتی تھیں بلکہ ان تانگوں

کے چاروں طرف چادریں تنا کرتی تھیں 'آج وہی گھرانے ہیں جن کی بہو بیٹیاں' پوتیاں اور نواسیاں آج سڑکوں پر بے حجاب ہی نہیں' نیم عریاں لباس میں گھومتی پھرتی نظر آ رہی ہیں۔

ایسی عورتوں پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی ہے جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ)) (صحیح البخاری)
''دنیا میں بہت سی کپڑے پہننے والیاں آخرت میں ننگی ہوں گی۔''

لباس تو پہنا ہوا ہے' لیکن اتنا باریک ہے کہ اس سے جسم جھلک رہا ہے' یا لباس تنگ ہے کہ عورت کے لطیف جسم کے دلفریب اعضاء نمایاں ہو کر دعوتِ گناہ دیتے ہیں' یا وہ اعضاء جیسے سینہ کا بالائی حصّہ' گردن' چہرہ ' سر اور پورے کے پورے بازو کھلے ہوئے ہیں جن کا ڈھانپنا ازروئے شرع ضروری ہے -----تو یہ ننگی ہیں۔ ننگی عورتیں آج برسرِعام گھوم پھر رہی ہیں' اور یہ تمام خواتین مسلمان کہلاتی ہیں۔ بہرحال یہ بھی انفرادی عمل ہے۔ اس کے بارے میں ہرگز ہرگز یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ساتھ یہ مجبوری تھی یا وہ مجبوری تھی۔یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔ اگر آپ کا اپنے گھر پر قابو نہیں ہے تو پھر بحیثیت مرد گھر کے قوام اور حاکم نہیں ہیں' محکوم ہیں -----اور محکومی سے آزاد ہونے کی کوشش کرنا' محکومی کے بندھن توڑدینا ایک مردِ حُر کی شان ہوتی ہے۔

لیکن اس سے آگے عمل کا ایک دائرہ اور ہے۔ وہ دائرہ یہ ہے کہ قرآن کے بعض تشریعی احکام وہ ہیں کہ جب تک نظام نہ بدلے ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا' یہ آپ نہیں کاٹ سکتے ۔غیر شادی شدہ مرد و عورت پر زنا کی حد یہ ہے کہ ان پر سو سو کوڑے برسائے جائیں' یہ سزا آپ نہیں دے سکتے۔ شادی شدہ مرد یا عورت کے زنا میں ملوث ہونے کی حد رجم یعنی سنگسار کرنا ہے' یہ کام آپ نہیں کر سکتے۔ قتلِ عمد میں مقتول کے ورثاء کے ہاتھ میں فیصلہ کا حق ہے کہ وہ چاہیں تو معاف کریں' چاہیں تو خون بہا میں کوئی رقم لے کر چھوڑ دیں اور چاہیں تو قصاص میں اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں' آپ از خود یہ فیصلے نہیں

کر سکتے۔ اسی طرح قتلِ ناحق کی دیت کا معاملہ ہے اور دوسرے بھی قوانین ہیں جن پر انفرادی طور پر کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔ یہ قوانین ملک کے اجتماعی نظام سے متعلق ہیں۔ ان کا نفاذ اسی وقت ہو سکتا ہے جب حکومت کی سطح پر فیصلے ہوں۔

اسی طرح سود کی حرمت کا معاملہ ہے۔ اس سے آپ انفرادی طور پر تو بچ سکتے ہیں اور جس حد تک بھی بچ سکیں' یہ آپ پر واجب ہی نہیں فرض ہے۔ البتہ ملک کے اقتصادی نظام کو سود کی غلاظت سے پاک کرنا انفرادی طور پر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا تعلق بھی ملک کے اجتماعی نظام سے ہے۔اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ کوئی شخص چاہے سود سے بچ جائے لیکن سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔یہ تو جب ہی ممکن ہوگا جب الصادق والمصدوق ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے اور ان شاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔ آج کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ سود کے غبار سے بچا ہوا ہے۔ لیکن ایک مسلمان بندہ یہ تو کر سکتا ہے کہ ساری عمر کرائے کے مکان میں رہے اور سودی قرضہ لے کر بنگلہ اور کوٹھی نہ بنائے -------- جب کہ

کتنے ہی حاجی ہیں اور کتنے ہی مسجدوں کے متولی اور منتظمین ہیں‘ جنہوں نے سودی قرضے لے کر بلڈنگوں پر بلڈنگیں کھڑی کر رکھی ہیں‘ اور بینک کے سود سے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا کاروبار جمایا جا رہا ہے۔

بہرحال آپ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ جن اسلامی احکام و قوانین پر نظام کے بدلنے کی صورت ہی میں عمل درآمد ہو سکتا ہے اور ہم اس معاملہ میں مجبور ہیں تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہو گی؟ وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو بدلنے کی کوشش کرو! اگر جدّوجُہد کر رہے ہو‘ تن من دھن لگا رہے ہو‘ وقت صرف کر رہے ہو‘ توانائیاں اور قوتیں کھپا رہے ہو‘ تب تو اللہ کے ہاں بَری ہوجائو گے اور یہ کہہ سکو گے کہ اے ربّ‘ جو کچھ ہمارے بس میں تھا اس سے ہم نے دریغ نہیں کیا۔ لیکن اگر یہ کام‘ یہ جدّوجُہد‘ یہ سعی و کوشش نہیں کر رہے اور اسی ماحول میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور اپنے معیارِزندگی کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے اور مال دار ہی نہیں خالص سرمایہ دار بننے میں روزو شب صرف ہو رہے ہیں‘ ساری

بھاگ دوڑ‘ ساری تگ و دو‘ ساری توجہات دنیا کمانے میں صرف ہو رہی ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ دین کے اس حصّہ پر جس کا تعلق اجتماعی نظام سے ہے‘ عمل پیرا نہ ہونے کے بھی آپ اللہ کے ہاں مجرم قرار پائیں گے۔

یہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے کہ نظام کو بدلنے کی سعی و کوشش کا طریق کار کیا ہے! اس ضمن میں ’’استحکامِ پاکستان‘‘ کے عنوان سے میرے جو مضامین قسط وار روزنامہ جنگ میں شائع ہوئے تھے‘ وہ اسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ’’اسلامی انقلاب‘‘ کے منہج کے کچھ نہ کچھ خدوخال آپ حضرات کے سامنے آسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں میری دس تقاریر ’’منہج انقلابِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام‘‘ یعنی سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ‘ فلسفہ انقلاب کے نقطہ نظر سے‘‘ کے موضوع پر ماہنامہ میثاق میں شائع ہوچکی ہیں اور ان کے کیسٹس بھی موجود ہیں(۲)۔ میں نے اسلامی انقلاب کا جو طریق و منہج سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے معروضی مطالعہ کے نتیجہ میں اخذ کیا ہے‘ اور جو حضور ﷺ ہی کی سیرتِ مطہرہ سے مستنبط کیا ہے اُسی کو میں نے ان تقاریر میں بیان کیا ہے۔

اصولی طور پر یہ بات گرہ میں باندھ لیجیے کہ عمل بالقرآن کے ذیل میں ایک انفرادی عمل ہے۔ اس پر ہر دم‘ ہر لحظہ‘ ہر آن‘ ہر مسلمان مکلّف ہے‘ میں بھی مکلّف ہوں اور آپ بھی۔ عمل نہیں کر رہے تو ہم میں سے کوئی بھی عدالت خداوندی میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ہاں عمل بالقرآن کے ضمن میں اجتماعی نظام سے متعلق جو حصّے ہیں‘ ان پر اُس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ نظام نہ بدلے۔نظام بدلنے کا نام ہی انقلاب ہے۔ اس انقلابِ اسلامی کو برپا کرنے کی جدّوجُہد کرنا‘ اس کے لیے سعی و کوشش کرنا‘ اس کے لیے محنت و مشقت جھیلنا‘ اس کے لیے تن من دھن لگانا‘ یہ چیزیں گویا قائم مقام ہو جائیں گی‘ دین کے ان حصوں پر عمل کرنے کی جن پر غیر

اسلامی نظام کے مسلط و مستولی ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے' وہ علیم بالذات الصدور ہے۔ اگر ہم اُس کے دین کی اجتماعی نظام پر اقامت کے لیے' خلوصِ دل سے اور صحیح نہج پر

_____(۲) الحمد للہ یہ دس تقاریر اسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوتی ہیں۔ (ادارہ)

جدّوجُہد کرتے رہیں گے تو توقع ہے کہ وہ غفور ورحیم ہماری ان مساعی کو نظام سے متعلق حصوں پر عمل پیرا نہ ہونے کے عذر کے طور پر قبول فرمالے گا۔

پانچواں حق: اسے دوسروں تک پہنچائو

اب آیئے پانچویں اور آخری حق کی طرف۔ ماننے' پڑھنے' سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ قرآن مجید کا ہر مسلمان پر حسب ِصلاحیت و استعداد یہ حق بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اسے پھیلائے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی اصل اور جامع اصطلاح ''تبلیغ'' ہے۔ اس تبلیغ کے ضمن میں خاتم النّبیین' سیّد المرسلین جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنے آخری خطبہ میں یہ ذِمّہ داری امت کو منتقل فرمائی ۔ آپؐ نے پہلے تو سوال کیا : ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟))''لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟'' اور پورے مجمع نے جواب میں عرض کیا: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ ''(حضور ﷺ !) بے شک ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق ِ تبلیغ ادا فرمادیا' حق اِمانت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا''۔ نبی اکرم ﷺ نے یہی سوال تین مرتبہ دہرایا -------اور تین دفعہ جواب لے کر پھر آپؐ نے آسمان کی طرف اپنی انگشت مبارک اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ''اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا''-------یہ مان رہے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام' تیرا کلام' تیرا دین ان تک پہنچا دیا۔ پھر اُن لوگوں سے جو حجۃ الوداع کے موقع پر موجود تھے اور جن کی تعداد بعض روایات میں سوا لاکھ تک آئی ہے 'مخاطب ہو کر فرمایا:((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))''اب پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں اُن لوگوں تک جو موجود نہیں!''اس لیے کہ میری رسالت صرف تمہارے لیے نہیں ہے۔ میں تو پوری نوع انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں: {وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا}(سبا:۲۸) پوری نوعِ بشر تک قرآن کی تبلیغ میری ذِمّہ داری ہے۔ مَیں نے تم تک پہنچا دیا۔ اب میری طرف سے تم ذِمّہ دار ہو کہ اسے بنی نوعِ آدم تک پہنچائو۔ تبلیغ قرآن کی یہ ذِمّہ داری ہے جو نبی آخر الزمان ﷺ نے اُمّت کے سپرد فرما کر الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی کی طرف مراجعت فرمائی۔

تبلیغ قرآن کی اس ذِمّہ داری کو نبی اکرم ﷺ نے اس درجہ عام کیا ہے کہ ارشاد فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) (صحیح البخاری) ''پہنچائو میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت''۔ یہاں ''عَنِّیْ'' کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ انگریزی میں 'on my behalf' جو مفہوم ادا کرتا ہے بالکل وہی مفہوم ''عَنِّیْ'' کا ہے ------- اس حدیث کے ضمن میں لوگوں کو کچھ مغالطے ہیں ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کا بیان کرنا' اس کو پھیلانا اور اس کی تبلیغ کرنا توصرف ان علماء کرام کا کام ہے جنہوں نے چودہ یا سترہ علوم پڑھ رکھے ہوں۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اصل میں چودہ یا سترہ علوم واقعتاً ضروری ہیں لیکن اُن کے لیے جو مسندِ افتاء پر بیٹھے ہوں' جنہیں فتاویٰ دینے ہوں کہ کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے ! کیا حلال ہے کیا حرام ہے ! فلاں مسئلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے ! فلاں اُلجھن میں شریعت کیا حل بتاتی ہے ! نکاح و طلاق کے احکام کیا ہیں ! وراثت کے قوانین کیا ہیں ! مضاربت و مشارکت کے قواعد و ضوابط کیا ہیں۔ اور بہت سے وہ تشریعی و فقہی مسائل جن سے لوگوں کو تمدنی زندگی میں بارہا سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ واقعتاً بہت بڑی ذِمّہ داری ہے۔

مَیں اس کی اہمیت کی وضاحت کے لیے یہ بات نہایت زور دے کر کہہ رہا ہوں ۔ اگر کوئی حدیث اور فقہ کا ماہر نہیں' قرآن و حدیث کے ناسخ و منسوخ سے واقف نہیں' مختلف ائمہ فقہ کی آراء سے ناواقف ہے اور ان کے دلائل کو نہیں جانتا تو وہ کسی مسئلہ میں فتویٰ کیسے دے سکے گا؟ اس کے لیے صرف و نحو اور لغت میں مہارت کی بھی ضرورت ہے۔ پھر علم تفسیر و تاویل' اصولِ تفسیر' اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ جیسے علوم پر جب تک انسان کی نظر نہ ہو وہ فتویٰ دینے کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ علم کے بغیر اور لاعلمی کی بنیاد پر کوئی فتویٰ دے دینا درحقیقت اپنے آپ کو بڑے فتنہ میں ڈالنا ہے۔ یہ تمام احتیاطیں فتویٰ دینے کے لیے ملحوظ رکھنی ضروری ہیں' تبلیغ کے لیے نہیں۔ تبلیغِ قرآن کے لیے تو حضور ﷺ کی عام اجازت ہے کہ جس نے ایک آیت اچھی طرح سمجھ لی ہے' وہ ایک آیت ہی پہنچائے ۔ ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) کا ارشاد اسی عموم کو واضح کر رہا ہے ۔جس نے آگے بڑھ کر ایک سورت سمجھ لی ہے' وہ ایک سورت پہنچائے' اسے عام کرے۔ یہ عمل جب تک عوامی سطح پر نہیں

ہوگا' ہمارے معاشرے کی اور ہمارے عوام کی قرآن مجید سے جو دُوری ہے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

یہی اعتراض لوگ کبھی ہم پر کر دیتے ہیں' کبھی تبلیغی جماعت والوں پر کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ درسِ قرآن یا تبلیغ دین کے لیے کھڑے کر دیے جاتے ہیں جبکہ یہ لوگ علومِ دینیہ سے واقف نہیں ہیں اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ فتویٰ نہیں دے رہے ہوتے بلکہ وہ تو لوگوں کو خیر کی تلقین کرتے ہیں' نصیحت کرتے ہیں' بھلائی کی طرف بلاتے ہیں' عبادتِ ربّ کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب علم بتا دے کہ فلاں بات تم نے صحیح نہیں کہی ہے تو وہ اصلاح کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج اور مضائقہ نہیں 'بلکہ عوامی سطح پر

دعوت الی القرآن اور دعوت الی الخیر اس دور کی شدید ترین ضرورت ہے اور اس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر منظّم ہو کر کام کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ لیکن حال یہ ہو گیا ہے کہ نہ خود کچھ کرو اور نہ کسی اور کو کرنے دو۔ اس کا سارا نقصان کس کا ہوگا؟ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا' اُمّت کے بگاڑ میں اضافہ ہو گا۔ تمہارا جو کچھ بگڑے گا وہ آخرت میں جا کر بگڑے گا۔ وہاں جو جواب دہی کرنی ہو گی اس کو سوچ لینا۔ یہ اعتراضات عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اچھی طرح جان لیجیے کہ دعوت و تبلیغ' فتویٰ سے بالکل علیحدہ شے ہے۔ چنانچہ قرآن کی طرف دعوت دیجیے' قرآن کی تبلیغ کیجیے۔ اس کے لیے کوئی لمبے چوڑے علوم و فنون کی ضرورت نہیں۔ قرآن ناظرہ پڑھنا آتا ہے تو ناظرہ سکھائو' ترجمہ سیکھ لیا ہے تو ترجمہ سکھائو ! اگر کچھ مزید وضاحتیں تمہارے سامنے ہیں تو ان کو عام کرو۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ کوئی شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ نہ کہے۔ آخر ہماری اُمّت میں بڑے بڑے مفکرین' محدثین اور مفسرین گزرے ہیں۔ پھر بحمد اللہ ہمارے اس دور میں بھی متعدد ایسے علماء عظام گزرے ہیں جنہوں نے اردو میں قرآن حکیم کی تفاسیر کا بیش بہا اور بیش قیمت سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ کیا مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ علیہ نے ساری تفاسیر کا خلاصہ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں بیان نہیں کر دیا؟ کیا صاحب ''روح المعانی'' نے

عربی کی تمام تفاسیر کا عطر اپنی تفسیر میں پیش نہیں کر دیا؟ آج ہمارے لیے کتنی سہولت ہے ۔ آج ہمارے پاس صحابہ کرامؓ' تابعینؒ اور سلف کے مفکرین و مفسرین کے تفسیر قرآن کے ضمن میں مستند اقوال موجود ہیں۔ ان بزرگانِ دین کے حوالے سے کہو جو کچھ کہنا ہو۔ ہر پڑھے لکھے مسلمان پر' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' لازم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس فرمانِ مبارک کی تعمیل میں کہ ((بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) چراغ سے چراغ جلائے۔ ایک آیت سیکھ لی ہے' اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اللہ توفیق دے تو عربی کی ناگزیر حد تک تحصیل کرے اور پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا ترجمہ اور اس پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سمجھ لے اور انہیں عام کرے۔ جو مزید گہرائی میں جانا چاہتا ہے اور فقہی مسائل کو بھی جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے وہ مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا ادریس کاندھلویؒ کی تفاسیر ''معارف القرآن'' سے استفادہ کرے۔ جدید ذہنوں تک قرآن کا پیغام اور اس کی دعوت پہنچانا مقصود ہو تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''تفہیم القرآن'' اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''تفسیر ماجدی'' سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کے نظام اور اس کے اندرونی نظم بالخصوص سورتوں کے باہمی ربط و ضبط اور تعلق کو سمجھنے کا ذوق و شوق ہو تو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر ''تدبر قرآن'' اُس کے لیے مفید ہوگی۔

اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ کسی ایک شخص کی تفسیر آپ کے لیے کفایت نہیں کر

سکتی۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کے اتنے متعدد پہلو ہیں کہ سب پر بیک وقت عمیق نظر ڈالنا اور ان پر تدبر و تفکر کرنا کسی ایک شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہر شخص اپنے مزاج اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق قرآن کو دیکھتا ہے۔ مثلاً اِس وقت میرے سامنے ایک میز رکھی ہوئی ہے۔ جو حضرات دائیں طرف بیٹھے ہیں وہ ایک زاویہ سے اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کا ایک نقشہ ان کے ذہن میں قائم ہو رہا ہے۔ جو لوگ بائیں طرف بیٹھے ہیں وہ ایک دوسرے زاویہ سے اسے دیکھ رہے ہیں ' ان کے ذہن میں اس کی تصویر کچھ اور ہے۔ اور جو حضرات سامنے بیٹھے ہیں اور سامنے سے میز کو دیکھ رہے ہیں انہیں ایک تیسرے زاویہ سے اس کی شکل کچھ اور نظر آ رہی ہے ۔ اگرچہ میز ایک ہی ہے ' لیکن زاویہ

نگاہ کے فرق کی وجہ سے کسی کو اس کا کوئی ایک حصّہ زیادہ واضح طور پر نظر آ رہا ہے اور کسی کو کوئی دوسرا حصّہ۔ اسی طرح قرآن مجید ایک ہی ہے لیکن جب اہلِ علم مختلف زاویوں (angles) سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی کے سامنے کوئی ایک پہلو اور کسی کے سامنے کوئی دوسرا پہلو زیادہ نمایاں ہو کر آتا ہے۔ جس شخص کے دل میں دعوت رجوع الی القرآن اور تبلیغ قرآن کا کماحقہ فریضہ انجام دینے کا شدید داعیہ بیدار ہو اُس کا کام یہ ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پہلوئوں کو جمع کر لے ۔ بہرحال حسبِ صلاحیت وا ستعداد کسی نہ کسی درجہ میں قرآن کو عام کرنا اور پھیلانا اور اسے دوسروں تک پہنچانا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ہر اُمتی کا فرضِ منصبی ہے۔

الحمد للہ مَیں نے جو بات عرض کی تھی کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن مجید کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں------ پہلا: ایمان و تعظیم' دوسرا تلاوت و ترتیل' تیسرا تذکر و تدبر' چوتھا حکم و اقامت اور پانچواں تبلیغ اور دعوت الی القرآن------ بفضلہ تعالیٰ وعونہٖ مَیں نے اپنی امکانی حدتک ان کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں اس حدیث شریف کی تشریح و توضیح بیان کرنا چاہتا ہوں جو مَیں نے آغاز میں آپ حضرات کو سنائی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ ساری باتیں جامعیت کے ساتھ اس ایک حدیث میں بیان فرما دی ہیں۔ یہ حدیث حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسے امام بیہقیؒ اپنی کتاب ''شعب الایمان'' میں لائے ہیں ۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا ایک نوع کا خطبہ ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ)) ''اے قرآن والو!'' جن لوگوں نے یہ حدیث پہلے نہ سنی ہو ان کو یہ طرزِ تخاطب عجیب لگا ہو گا۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے: یَا اَھْلَ الْکِتَابِ ۔ مجھے اس اعتبار سے یہ حدیث بڑی پیاری لگتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں مخاطب ہو کر فرمایا: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ)) ''اے قرآن والو!'' سبحان اللہ' کتنا پیارا خطاب ہے جو اُمّتِ مسلمہ کو ملا ۔ مَیں اپنی بعض تقاریر میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ ہماری بہت سی

غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے ''اھل القرآن'' کا نام اختیار کرلیا ہے' ہم نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے' حالانکہ یہ نام انہوں نے انکارِ سُنّت و حدیث پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ ان کا اصل نام ہونا چاہیے ''منکرین سُنّت اور منکرین حدیث ''۔ یہ ہماری بڑی نادانی ہے کہ ہم نے اُن کے اس غاصبانہ قبضے کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا 'جبکہ حقیقت میں ''اھل القرآن'' وہ نہیں ہیں' ہم ہیں۔

اس حدیث شریف کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے ۔کتنے بلیغ ہیں یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں' ان کا کمال اختصار مگر جامعیت کے ساتھ احاطہ کرلیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَاتَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ))''اے اہلِ قرآن ! قرآن کو تکیہ مت بنا لینا''۔ اس میں کتنی فصاحت وبلاغت ہے۔ حضور ﷺ خودفرماتے ہیں: ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَب)) ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''اور میں سمجھتا ہوں کہ فصاحت و بلاغت کی معراج ہے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ ((لَاتَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ))کیا معنی؟ ایک تو آدمی تکیہ پر سہارا لیتا ہے' لہٰذا ایک مفہوم تو یہ ہوا کہ اے اہل قرآن ! اس قرآن کو محض ایک ذہنی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم قرآن کو ماننے والے ہیں۔ ہمارا وطیرہ ہے کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک خانہ کھول رکھا ہے اور اسے اچھے سے اچھے جزدان میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے۔ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑ جائے' چاہے وہ جھوٹی قسم ہو' تو اس کتابُ اللہ کے حوالہ سے کھا لی جائے اور جھوٹی شہادتوں کے لیے اس کی آڑ لے لی جائے۔ ہدایت حاصل کرنے کے لیے مطالعہ ٔقرآن خال خال ہی رہ گیا ہے۔ حصولِ ثواب کے لیے اس کی تلاوت کے التزام و اہتمام میں بھی روز بروز کمی آ رہی ہے اور اب تو تلاوت کا زیادہ مصرف '' ایصالِ ثواب'' ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ یا بقول علّامہ اقبال 'قرآن سے اتنا تعلق رہ گیا ہے کہ :

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین اُو آساں بمیری !

(اس قرآن کی آیات سے تمہارا تعلق بس اسی قدر رہ گیا ہے کہ قریب الموت شخص کو سورۂ یٰسین سنا کر اس کی موت کو آسان بنا دیا جائے ۔)

جب کہ قرآن پر ایمان سے تو بڑی ذِمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اُن کو ادا کرنے کی فکر کریں 'نہ کہ اسے محض ایک ذہنی سہارا بنا لیا جائے -------دوسرا مفہوم یہ ہوا کہ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے تو اے اہلِ قرآن ' اس قرآن کو پسِ پشت نہ ڈالِ دینا ! جیسے سورۃ البقرۃ میں یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا گیا

ہے : {نَبَذَ فَرِیۡقٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُہُوۡرِہِمۡ}(آیت ۱۰۱) ''جن لوگوں کو (اللہ کی طرف سے) کتاب دی گئی تھی' ان میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا'' -----یعنی وہ اس سے بے نیاز اور بے پروا ہو گئے۔ تو اہلِ قرآن ! تم ایسا ہرگز نہ کرنا ------ ((لَاتَتَوَسَّدُوا الْقُرآنَ))میں یہ دونوں مفہوم آ گئے۔ اس طرزِ عمل سے بچنا ہے تو پھر کیا کرنا ہے؟ملاحظہ کیجیے' حضور ﷺ نے آگے ارشاد فرمایا: ((وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ)) ''اس کو پڑھا کرو ' اس کی تلاوت کیا کرو ' جیسے اس کی تلاوت کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی''۔دوسری بات کیا فرمائی :((وَافْشُوْہُ)) ''اسے پھیلائو' اسے عام کرو''۔ یہ لفظ کیا ہے ! آپ افشائے راز استعمال کرتے ہیں۔ راز افشاء ہو گیا یعنی راز کھل گیا ' راز کی بات تھی عام ہو گئی' اس کا چرچا ہو گیا۔ حضور ﷺ نے وہ لفظ استعمال فرمایا:((اَفْشُوْہُ))اس قرآن کو عام کرو' اسے پھیلائو' اسے دوسروں تک پہنچائو اور چہار دانگ عالم کو اس کے نور سے منور کردو۔تیسری چیز کیا فرمائی : ((وَتَغَنَّوْہُ))---------اس کے دو معانی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کو غنا کے ساتھ 'تغنی کے ساتھ پڑھو' خوش الحانی کے ساتھ پڑھو۔ مَیں اس کے ضمن میں آپ کو دو حدیثیں سنا چکا ہوں۔ ایک یہ کہ : ((زَیِّنُوا الْقُرآنَ بِاَصْوَاتِکُمْ)) ---- دوسری یہ کہ : ((مَنْ لَمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرآنِ فَلَیْسَ مِنَّا)) ---اس کے دوسرے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے سے غنی ہو جائو' مستغنی ہو جائو' کسی کے سامنے اپنی احتیاج کے لیے دست سوال دراز نہ

کرو۔ قرآن سب سے بڑی دولت ہے' اس دولت سے دامن بھر لو ' اللہ تمہیں غنی کر دے گا ----آخری بات کیا فرمائی: ((وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ)) ''اور اس (قرآن) میں تدبر کرو '' ------ اس کی گہرائیوں میں غوروفکر کرو' اس کے معانی کے سمندر میں غوطہ زنی کرو۔ ع

''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں !''

جتنی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرو گے' علوم و معارف اور عرفان کے اتنے ہی قیمتی خزینے ملیں گے۔ ((وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) ''اور قرآن میں تدبر کرو' غوروفکر کرو' تاکہ تم کامیاب ہو جائو' بامراد ہو جائو' کامران ہو جائو' فوز و فلاح سے ہمکنار ہو جائو''۔ میں صمیم قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین !

اب صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے۔مَیں نے کئی بار اپنے کتابچے کا ذکر کیا ہے جس کا عنوان ہے : ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق''۔ الحمد للہ اس کتابچے کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور یہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اس کے تراجم انگریزی 'عربی اور فارسی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔اس کتابچے

کے بارے میں اس وقت مجھے ایک خاص بات عرض کرنی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حالات کچھ اس طرح سازگار ہوئے کہ مجھے ۱۹۷۰ء(۱۳۹۰ھ) کا پورا رمضان مدینہ منورہ میں گزارنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔ آج بھی اس کی یادوسے کبھی کبھی اپنے دل و دماغ کو معطر کر لیتا ہوں۔ آخری عشرے میں مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر رمضان میں آخری عشرے میں مسجد نبویؐ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ مَیں نے ان کی خدمت میں اپنے اس کتابچے کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ پیش کیا اور ان سے استدعا کی کہ مَیں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانا چاہتا ہوں' آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی اصلاح فرما دیں۔ میں مولانا نور اللہ مرقدہ کا بڑا احسان مند ہوں کہ انہوں نے حالتِ اعتکاف میں مسجدِ نبوی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام میں اسے بالاستیعاب پڑھا اور صرف ایک مقام پر اصلاح تجویز فرمائی۔ میں نے اس کے مطابق اپنے فقرہ کو بدل دیا۔چنانچہ پہلے ایڈیشن کے بعد سے' جو بڑی

محدود تعداد میں شائع ہوا ' اب تک جو کتابچہ چھپتا رہا ہے اور پھیلتا رہا ہے ' اس کے ایک ایک لفظ کو بحمدِ اللہ مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم و مغفور کی تصدیق و تصویب کی سعادت حاصل ہے۔

مَیں آپ کو دعوت دوں گا کہ مسلمانوں میں قرآن مجید'فرقانِ حمید کی طرف توجّہ اور التفات پیدا کرنے کے لیے اس کتابچے کوذریعہ بنایئے ' اسے خود بغور پڑھیے اور دوسروں تک پہنچایئے۔اس کا کوئی حق تصنیف نہ میرا محفوظ ہے' نہ انجمن خدام القرآن کا' نہ تنظیم اسلامی کا۔ اس کو کوئی فردیا ادارہ چھاپے' مفت تقسیم کرے یا قیمتاً فروخت کرے' میری اور انجمن کی طرف سے کوئی قانونی اور اخلاقی پابندی سرے سے عائد نہیں ہے۔مَیں اغلباً ۱۹۸۱ء میں جب پہلی بار دعوتی دورے پر امریکہ گیا تھا تو شکاگو میں سیاہ فام مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے' جس کے امیر وارث علی جاہ ہیں جو الحمد للہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ میں نے ان کو اس کا انگریزی ترجمہ مطالعہ کے لیے دیا تھا۔دوسری ملاقات میں انہوں نے اس کتاب کی تحسین کی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔مَیں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اسے اپنی تنظیم کی طرف سے شائع کیجیے اور میرے نام کے بغیر شائع کیجیے۔ مبادا یہاں کے لوگوں کے لیے یہ بات حجاب بن جائے کہ یہ کسی پاکستانی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ میری تمنّا اور آرزو تو یہ ہے کہ یہ فکر عام ہو۔ مسلمانوں میں اعتصام اور تمسک بحبل اللہ کا جذبہ ازسرِنو بیدار ہو جائے اور وہ رسولِ خاتم ﷺ کے اس آلۂ انقلاب کو ہاتھ میں لے کر دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ میری حقیر سی توانائیاں اسی مقصد کے لیے لگ رہی ہیں' اور اسی کے لیےمَیں امسال آپ کے شہر کراچی میں یہ رمضان گزارنے اور تراویح کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں یہ کام اپنے توشہ آخرت کے پیش نظر انجام دے رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرمائے۔

اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کے اس ارشادِ گرامی پر میرا کامل ایمان ہے ‘جس کے راوی ہیں نبی اکرم ﷺ کے دوسرے خلیفہ راشد امیر المومنین فاروق اعظم حضرت

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور جسے امام مسلم رحمہ اللہ علیہ اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))’’اللہ تعالیٰ اس کتاب عزیز (کے اعتصام و تمسک) کی بدولت کچھ قوموں کو رفعت و سربلندی سے نوازے گا اور اس (کتاب کو ترک کرنے) کے باعث کچھ دوسری قوموں کو ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا‘‘۔ علّامہ اقبال نے ’’جوابِ شکوہ‘‘ کے ایک شعر میں اس حدیث کی بایں الفاظ ترجمانی کی ہے ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

آج پوری دنیا میں مسلمان جس انحطاط اور ذلت و نکبت سے دوچار ہیں اور ضلالت و گمراہی کے اندھیارے ہمیں جس طور پر ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لے رہے ہیں تو اس کا اصل سبب مہجوریٔ قرآن اور ترک قرآن ہی ہے۔ ورنہ نبی اکرم ﷺ تو حجۃ الوداع میں اُمّت کو پیشگی تنبیہہ فرما گئے تھے کہ اس قرآن کو تھامے رہو گے تو ابدالآباد تک گمراہ نہیں ہو گے!
((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا: کِتَابَ اللہِ))(صحیح مسلم)
’’(مسلمانو!) مَیں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو تم ہرگز کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے‘ اور وہ چیز ہے کتاب اللہ!‘‘

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذّکر الحکیم

* * *

عظمتِ صیام و قیامِ رمضان المبارک

جامع مسجد ناظم آباد نمبر۵، کراچی میں

''استقبالِ رمضان المبارک'' کا خطاب

(بتاریخ: ۳۰ شعبان المعظم ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء)

نَحمدہ ونُصَلِّی علٰی رسولہ الکریم

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد

آج ہم اللہ کے نام سے اور اس کی نصرت و تائید کے بھروسہ پر دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کر رہے ہیں۔ اس کا طریق کار یہ ہوگا کہ چار رکعات تراویح میں قرآن حکیم کا جتنا حصّہ پڑھا جانا ہوگا، ہم قرآن مجید سامنے رکھ کر پہلے اس کا اس طور پر مطالعہ کریں گے کہ مَیں متن کے ساتھ ساتھ ترجمہ کروں گا اور جہاں ضرورت ہوگی وہاں مختصر تشریح و توضیح بھی کرتا رہوں گا۔ اس طرح ہر چار رکعاتِ تراویح میں قرآن مجید کے تلاوت کیے جانے والے حصے کا ترجمہ اور مختصر تشریح ہمارے سامنے آتی رہے گی۔ اس کا بہت مفید اور نہایت افادیت والا پہلو یہ ہے کہ قیام میں قرآن کا جتنا حصّہ پڑھا جائے گا، اس کے اکثر و بیشتر ترجمے اور مفاہیم سے سامعین کی ذہنی مناسبت قائم رہے گی اور اس طور پر، ان شاء اللہ، یہ تراویح کی نماز ہمارے لیے نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائے گی۔

پچھلے دو سالوں میں ہم قرآن اکیڈمی لاہور کی مسجد جامع القرآن میں اسی طور پر دورۂ ترجمہ قرآن کر چکے ہیں، اور الحمدللہ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے۔ لوگوں نے ہماری توقعات سے بڑھ چڑھ کر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ شہر کے بعض معروف فزیشن، سرجن، پروفیسر، وکلاء اور تاجر حضرات کے علاوہ عام پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد غایت درجے کے دلی اشتیاق اور پابندی کے ساتھ اس میں

مستقل طور پر شریک رہی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا ‘خاص طور پر آخری عشرے میں ‘کہ بلامبالغہ جامع القرآن کے وسیع و عریض ہال میں اور پھر صحن میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی اور کچھ حضرات کو واپس جانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ہماری معلومات کی حد تک‘ اس طرح ہر چار رکعاتِ تراویح سے قبل ان رکعتوں میں پڑھے جانے والے قرآن کے مکمل حصّے کے ترجمے کا مختصر تشریح و توضیح کے ساتھ بیان برصغیر پاک و ہند میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور اس کی سعادت قسامِ ازل نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نصیب میں رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فضل و احسان پر ہم اللہ تعالیٰ کا کماحقہ شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

اس سال کے رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے لیے کراچی کے احباب کا اصرار تھا کہ اسے کراچی میں رکھا جائے ۔ خود میری بھی خواہش تھی کہ اس کام کو اہلِ کراچی سے متعارف کرایا جائے۔ اس ضمن میں فاران کلب کے اربابِ حل و عقد نے جگہ اور دوسرے انتظامات کی پیش کش کی تھی ‘ لیکن جگہ و سعت کے لحاظ سے ناکافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد اس جامع مسجد کے منتظمین اور محترم خطیب صاحب سے رجوع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے بڑی خوشی سے مسجد کا اوپر والا ہال جس میں ہم اس وقت بیٹھے ہیں‘ اس کام کے لیے عنایت فرما دیا اور دیگر ضروریات فراہم کرنے کے سلسلہ میں بھی بھرپور تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے اس بیش بہا دینی تعاون کو قبول فرمائے ! دورۂ ترجمہ قرآن کے آغاز سے قبل یہ بہت مناسب موقع ہے کہ ہم رمضان المبارک کے استقبال کے لیے آج وقت صرف کریں‘ تاکہ اس ماہ کی برکات سے صحیح طور پر مستفید ہونے کے لیے ہماری کچھ ذہنی تیاری ہوجائے۔

خطبہ استقبالِ رمضان المبارک

آپ چشمِ تصوّر سے یہ دیکھئے کہ آج سے چودہ سو برس قبل مسجد نبویؐ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جمع ہیں اور ان کے سامنے رمضان المبارک کے بیان کے لیے نبی اکرم ﷺ یہ خطبہ ارشاد فرمارہے ہیں۔ امام بیہقی روایت کرتے ہیں: عن سلمان

الفارسی رضی اللہ عنہ قال: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ ا فِیْ آخِرِ یَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ ’’حضرت سلمان فارسی رضی للہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک خطبہ دیا۔ اس میں ارشاد فرمایا‘‘ ((یَا اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّکُمْ شَھْرٌ عَظِیْمٌ...)) ’’اے لوگو ! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہورہا ہے۔‘‘ ظِل ’’سایہ‘‘کو کہتے ہیں۔ گویا رمضان کا سایہ شعبان کی آخری تاریخ سے پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ ((شَھْرٌ مُبَارَکٌ)) ’’یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے۔‘‘ ((شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ شَھْرٍ)) ’’اس (مبارک) مہینہ میں ایک رات (شب قدر) ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔‘‘ حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں قرآن مجید کی سورۃ القدر کی طرف اشارہ ہو گیا کہ {اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ

﴿ ۱ ﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ﴿ ۲ ﴾ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ﴿ ۳ ﴾ } ''ہم نے اس (قرآن) کو شب ِقدر میں نازل کیا ہے۔ اور (اے نبی ﷺ !)آپ کیا سمجھتے کہ شب ِقدر کیا چیز ہے ! (یہ) شب قدر (خیروبرکت میں) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

خطبہ میں حضور ﷺ نے آگے ارشاد فرمایا: ((جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا)) ''اللہ نے اس مہینے کا روزہ رکھنا فرض ٹھہرایا ہے اور رات میں قیام کرنے (یعنی تراویح) کو نفل قرار دیا ہے۔'' اس بات کو میں آگے چل کر وضاحت سے بیان کروں گا کہ نماز ِتراویح کی کیا اہمیت ہے' اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے' رمضان المبارک کی راتوں کے قیا م کی اصل روح کیا ہے' اس کا قرآن مجید کے ساتھ ربط و تعلق اور اس کی عظیم ترین افادیت کیا ہے ! ! البتہ نوٹ کر لیجیے کہ حضور ﷺ کے اس خطبہ میں الفاظ ہیں: ((جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا))قیام اللیل تو ہر شب میں نفل ہے اور اس کی بڑی فضلیت ہے' لیکن حضور ﷺ کے ان الفاظِ مبارکہ سے صاف متبادر ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں قیام اللیل کی خصوصی اہمیت و فضلیت ہے۔ اگرچہ فرضیت نہیں ہے لیکن اللہ کی طرف سے اس کا تطوّع اور اس کی مجعولیت ثابت ہے' کیونکہ دونوں کے ساتھ فعل ''جَعَلَ اللّٰہُ'' آیا ہے۔

آگے فرمایا: ((مَنْ تَقَرَّبَ فِیْہِ بِخَصْلَۃٍ مِنَ الْخَیْرِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ)) ''جو کوئی بھی اس مہینہ میں نیکی کا کوئی کام کر کے اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنا چاہے گا تو اسے اس کا اجر و ثواب اتنا ملے گا جیسے دوسرے دنوں میں کسی فرض کے ادا کرنے پر ملے گا۔'' یعنی مسنون و نفلی نیکی اس ماہِ مبارک میں اجر و ثواب کے اعتبار سے عام دنوں کی فرض عبادت کی ادائیگی کے مساوی ہو جائے گی۔ا ور: ((وَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْہِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی سَبْعِیْنَ فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ))''اور جو کوئی اس مہینہ میں فرض ادا کرتا ہے تو اس کو دوسرے زمانہ کے ستر فرض ادا کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔'' گویا اگر ہم اس ماہِ مبارک میں ایک فرض نماز ادا کرتے ہیں تو غیر رمضان کی ستّر فرض نمازیں ادا کرنے کے برابر ثواب پانے کے مستحق ہوجاتے ہیں۔

آگے فرمایا: ((وَھُوَ شَھْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُہُ الْجَنَّۃُ)) ''اور یہ صبر کا مہینہ ہے' اور صبر کا اجر و ثواب جنت ہے۔''اس مہینہ میں ایک بندۂ مؤمن بھوک پیاس برداشت کرتا ہے ' جائز طریقہ سے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین سے بھی اجتنا ب کرتا ہے ' لوگوں کی کڑوی کسیلی اور ناخوشگوار باتوں پر خاموشی اختیار کرتا ہے' غیبت و زُور سے بچتا ہے۔ یہ تمام کام اور اسی نوع کے نواہی سے بچنا سب صبر کے مفہوم میں شامل ہیں ' اور اس صبر کا بدلہ جنّت ہے۔ حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں جہاں بشارت ہے وہاں بڑی فصاحت و بلاغت بھی ہے۔ ((وَشَھْرُ الْمُوَاسَاۃِ)) ''اور یہ آپس کی ہمدردی اور دَم سازی کا مہینہ ہے۔'' جس کسی کو کبھی بھوک پیاس کا تجربہ نہیں ہوتا تو

اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ کسی بھوکے پیاسے انسان پر کیا بیتتی ہے۔ اس مہینہ میں اسے بھی اندازہ ہوجاتاہے کہ بھوک کسے کہتے ہیں اورپیاس کیا ہوتی ہے ! اس طرح یقیناً دل میں انسانی ہمدردی کا ایک جذبہ بیدار ہوتاہے۔ ((وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ)) ''اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں مؤمن کے رزق میں اضافہ کردیا جاتاہے۔'' اس میں برکت ہوجاتی ہے۔

آگے ارشاد ہوا: ((مَنْ فَطَّرَ فِيهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةٌ لِذُنُوبِهِ وَعِتْقُ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ)) ''جو کوئی اس مہینہ میں کسی روزہ دار کا روزہ (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل

کرنے کے لیے(افطار کرائے گا' اس کے لیے اُس کے گناہوں کی مغفرت بھی ہوگی اور اُس کی گردن کا آتشِ دوزخ سے چھٹکارا پالینا بھی ہوگا۔'' ((وَكَانَ لَهُ مِثْلُ اَجْرِهِ)) ''اور اسے اس روزہ دار کے برابر اجرو ثواب بھی ملے گا'' ((مِنْ غَيْرِ اَنْ يُنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهِ شَيْءٌ)) ''بغیر اس کے کہ اس (افطار کرنے والے روزے دار(کے اجر میں سے کوئی بھی کمی کی جائے۔'' حضرت سلمان فارسیؓ اُن فقرائِ صحابہ کرامث میں سے تھے جن کے پاس اموال و اسبابِ دُنیوی نہ ہونے کے برابر تھے اور جن پر عام دنوں میں بھی فاقے پڑتے تھے ۔ان اصحابؓ کو اتنی مقدرت کہاں حاصل تھی کہ وہ کسی روزہ دار کو افطار کراسکتے ! چنانچہ اسی حدیث شریف میں آگے آتا ہے : قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللهِ لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ ''ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! ہم میں سے ہر ایک کو تور وزہ دار کا روزہ افطار کرانے کی استطاعت نہیں ہے(تو کیاہم اس اجر و ثواب سے محروم رہیں گے)؟'' اس پر حضور ﷺ نے جو جواب ارشاد فرمایا' اسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آگےبیان کرتے ہیں کہ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : ((يُعْطِي اللهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ شُرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ)) ''تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: یہ ثواب اللہ تعالیٰ اُس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسّی پر یا صرف پانی کے ایک گھونٹ ہی پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے گا۔''

اس دور میں ہمارے یہاں کھانے پینے کی اشیاء کی جو اِفراط ہے اُس وقت اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔اُس وقت اگر فقراءِ صحابہ کرام ث میں سے کسی کو افطار کے لیے کہیں سے کچھ دودھ مل جاتا تھا تو وہ اس میں پانی ملا کر لسّی بنالیا کرتے تھے ۔ کوئی رفیق ایسا ہو جسے یہ بھی میسّر نہیں تو اگر وہ اسے اس لسّی میں شریک کرلے تو اُس وقت کے حالات میں یہ بھی بہت بڑا ایثار تھا۔ آج ہم کو کھانے پینے کی جو فراوانی میسّر ہے اس کے پیش نظر ہم حضور ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کی حکمت کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ اُس دَور کی بات ہے جب کہ اُن فقراء صحابہ کرامث پر کئی کئی دن کے فاقے پڑتے تھے۔ حضرت

ابوہریرہ‘ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا یہ حال ہوتا تھا کہ کئی کئی دن کے فاقے سے مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی‘ لوگ یہ سمجھتے تھے شاید مجھ پر مرگی کا دورہ پڑا ہے اور آکر اپنے پائوں سے میری گردن دباتے تھے۔ شاید اُس دَور میں یہ بھی مرگی کا علاج سمجھا جاتا ہو! پھر یہ کہ وہاں پانی بھی بڑی کم یاب اور قیمتی شے تھا‘ بڑی دُور سے اسے کنوئوں سے کھینچ کر لانا پڑتا تھا۔ ماحول کے اس تناظر میں سمجھئے کہ حضور ﷺ کے ارشاد مبارک کا اصل منشا و مدّعا اس نوع کے ایثار و قربانی کے جذبے کو پیدا کرنے کی طرف تھا کہ لوگ اپنی ذات اور ضروریات کے مقابلے میں اپنے کمزور بھائیوں کی ذات اور ضروریات کا زیادہ خیال رکھیں۔ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ (یہاں ایک ضمنی بات یہ سمجھ لیجیے کہ جدید دَور کی عربی میں لبن دہی کو اور حلیب دودھ کو کہا جاتا ہے۔)

آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِي شُرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ)) ’’اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گا اسے اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی حوضِ کوثر) سے ایسا سیراب فرمائے گا کہ (میدانِ حشر کے مرحلہ سے لے کر بقیہ تمام مراحل میں) اس کو پیاس ہی نہیں لگے گی تاآنکہ وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔‘‘

آگے نبی ٔ رحمت‘ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ)) ’’اور یہ مہینہ وہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصّہ (یعنی پہلا عشرہ) اللہ کی رحمت کا ظہور ہے‘‘ ((وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ)) ’’اور اس کا درمیانی حصّہ (یعنی دوسرا عشرہ) مغفرتِ خداوندی کا مظہر ہے‘‘ ((وَآخِرُهٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ)) ’’اور اس کا آخری حصّہ (یعنی تیسرا عشرہ) تو گردنوں کو آتش دوزخ سے چھڑا لینے کی بشارت اور نوید سے معمور ہے۔‘‘ ((وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ)) ’’اور جو کوئی اس مہینہ میں اپنے غلام و خادم اور زیردستوں کی مشقّت میں تخفیف اور کمی کردے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آتش ِدوزخ سے آزادی عطا فرمائے گا۔‘‘

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث شریف کی رو سے یہ وہ خطبۂ

مبارکہ ہے جو نبی اکرم ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا ۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے کس طرح یہ چاہا کہ لوگ اس عظمت والے اور برکت والے مہینہ سے مستفیض و مستفید ہونے کے لیے ذہناً تیار ہو جائیں۔ اس لیے کہ جب تک کسی شخص کو کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا شعور نہ ہو‘ اُس وقت تک انسان اس سے صحیح طور پر اور بھرپور استفادہ کر ہی نہیں سکتا۔

روزے کی حکمت اور احکام

اب آئیے سورۃ البقرۃ کے تیئیسویں (۲۳) رکوع کی طرف جو چھ آیات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ روزے کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہے کہ اس سے متعلقہ مضامین‘ تمام احکام اور اس کی ساری حکمتیں

قرآن مجید میں اس مقام پر یکجا ہوکر آگئی ہیں۔ اس کا اوّلین حکم کیا تھا؟ ابتدائی رعایتیں کیا تھیں؟ آخری حکم کیا آیا؟ کتنی رعایتیں برقرار ہیں اور کو ن سی رعایت ساقط ہوگئی؟ روزے کے تفصیلی احکام کیا ہیں؟ روزے کی حکمت کیا ہے؟ روزے کا دُعا سے کیا ربط و تعلق ہے؟ روزے کی عبادت رزقِ حلال سے کس طور پر مربوط و متعلق ہے؟ روزے کی عبادت کے لیے ماہ رمضان المبارک کا انتخاب کیوں ہوا؟ رمضان المبارک کی مناسبت سے صوم کے ساتھ اضافی پروگرام کیا ہے؟ اس طرح جو دو آتشہ اور نورٌ علیٰ نور پروگرام بنتا ہے 'اس کا حاصل کیا ہے؟ یہ تمام مضامین اور موضوعات اس مقام پر چھ آیات میں آگئے ہیں۔

نماز جو ارکانِ اسلام میں سے رکن۔ رکین ہے' جسے حضور ﷺ نے ''عِمادُ الدّین'' اور ''قُـرَّةُ عَینی'' فرمایا ہے' اس کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ نماز کا ذکر قرآن مجید میں متفرق مقامات پر منتشر ملے گا۔ ارکانِ نماز قیام' رکوع' سجدے کا ذکر بھی ترتیب سے کسی ایک جگہ نہیں ملے گا بلکہ بعض جگہوں میں بھی فرق ہوگا۔ پھر وضو اور تیمم کا ذکر کہیں اور ہو گا۔ اوقاتِ نماز کا بیان متعدد اسالیب سے مختلف سورتوں اور آیتوں میں اشارات و کنایات میں ملے گا۔ صلوٰۃِ خوف کا ذکر کہیں اور ملے گا۔ الغرض نماز کے متعلق ساری باتیں کہیں ایک جگہ نہیں ملیں گی۔ پھر صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر قرآن مجید میں کثرت سے مختلف

مقامات پر نظر آئے گا۔ البتہ زکوٰۃ کا نصاب' مقادیر کا تعین اور ادائیگی کی مدّت کا ذکر پورے قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ اس کے جملہ تفصیلی احکام ہمیں سُنّت و حدیث شریف میں ملیں گے۔ اسی طرح حج کا معاملہ ہے۔ سورۃ البقرۃ کے دو 'رکوع اور سورۃ الحج کے دو 'رکوع تو وہ ہیں جن میں قدرے تفصیل سے مناسکِ حج کا ذکر ہے۔ پھر سورۂ آلِ عمران میں حج کی فرضیت بیان ہوئی ہے۔ سورۃ البقرۃ کے انیسویں (۱۹) رکوع میں سعی بین الصفا والمروۃ کا ذکر ہے۔ یوں حج کا ذکر بھی قرآن مجید میں کم از کم چار جگہ ملے گا ۔ البتہ صوم یعنی روزے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی ہمت کر کے ان چھ آیات کو سمجھ لے تو گویا ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن یعنی صوم کے بارے میں جو کچھ قرآن حکیم میں آیا ہے' اس کا علم اسے حاصل ہو جائے گا۔ اس پر اپنی توجہات کو مرتکز رکھیں گے تو 'ان شاء اللہ العزیز' آپ محسوس کریں گے کہ بہت بڑی دولت کا خزانہ ہاتھ آیا ہے۔

روزے کے ابتدائی احکام

ان آیات میں ایک بہت بڑا تفسیری اشکال ہے۔ یہ مقام مشکلات القرآن میں سے ہے اور اس ضمن میں مختلف تفسیری آراء ہیں۔ ان میں سے جس رائے پر میرا دل ٹھکا ہے وہ سلف میں بھی موجود ہے اور خلف میں بھی موجود ہے' لیکن متداولہ اُردو تفاسیر میں عام طور پر اس کا ذکر نہیں ہے' لہٰذا وہ رائے نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس کے لیے تمام دلائل دینا اس وقت ممکن نہیں ہو گا' کیونکہ ان آیات کا مفصّل درس پیش نظر نہیں ہے۔ وہ رائے

یہ ہے کہ اس رکوع کی پہلی دو آیات رمضان کے روزے کے متعلق نہیں ہیں بلکہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ابتدا میں آپؐ نے مسلمانوں کو ہر مہینے میں ایامِ بیض کے تین روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ ایامِ بیض سے مراد ہیں روشن راتوں والے دن یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں راتوں سے ملحق دن۔ ان تین دنوں کے روزوں سے متعلق ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کے طور پر ان دو آیات میں آ گئی۔ اس کے علاوہ دوسری آراء بھی ہیں، لیکن میرا دل اسی پر مطمئن ہوا ہے۔

جب مَیں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا، اُس وقت اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں

قرآن مجید کے غور و تدبر کے ساتھ مطالعے کی رغبت پیدا فرمائی۔ اسی مطالعہ اور غورو فکر کے نتیجہ میں ان دو آیات کے متعلق وجدانی طور پر میری یہ رائے بن گئی تھی کہ ان کا تعلق ایامِ بیض کے تین روزوں سے ہے، جن کا اہتمام دورِ نبویؐ سے تاحال نفلی روزوں کی حیثیت سے چلا آرہا ہے۔ البتہ اُس وقت جو بھی اردو تفاسیر میرے زیر مطالعہ رہتی تھیں، ان میں مجھے یہ رائے نہیں مل رہی تھی۔اچانک ایک روز میری نظر سے ماہنامہ'' زندگی'' رام پور (بھارت) میں (جو جماعت اسلامی ہند کا ترجمان تھا) ایک مضمون گزرا جس میں ایک صاحب نے مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ علیہ کی اس رائے پر تنقید کی تھی کہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۸۳ اور۱۸۴ (یعنی تیئیسویں رکوع کی پہلی دو آیات) کا تعلق رمضان المبارک کے روزوں سے نہیں بلکہ ایامِ بیض کے تین روزوں کی فرضیت سے ہے جو ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد نفل کے طور پر رہ گئے ہیں۔ یہی رائے میری تھی، تو مجھے اس مضمون سے تقویت حاصل ہو گئی کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ جن کو بیہقیٔ وقت کہا گیا ہے، کی بھی یہی رائے ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ علیہ کا شمار اپنے دَور کے ائمہ محدثین میں ہوتا ہے۔ لہٰذا میرے لیے ''متفق گردید رائے بو علی بارائے من'' والا معاملہ ہو گیا۔ اس طرح ایک بڑی مضبوط دلیل میرے ہاتھ آ گئی۔ اگرچہ مضمون نگار نے تو حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے پر تنقید کی تھی، لیکن مجھے اپنی وجدانی رائے کی تائید میں حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے ایک دلیل مل گئی۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد جب میں نے امام فخر الدین رازیؒ کی ''تفسیر کبیر'' کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ انہوں نے بہت سے ان تابعین کے ناموں کے حوالے سے جو مفسرین قرآن کی حیثیت سے مشہور ہیں، اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ ان دو آیات (۱۸۳، ۱۸۴) کا تعلق ان تین دن کے روزوں کی فرضیت کے حکم سے ہے جو اَب ایامِ بیض کے نفلی روزے کہلاتے ہیں۔ لہٰذا یہ رائے سلف میں بھی موجود تھی اور اس دَور میں حضرت انور شاہ کاشمیریؒ جیسے جید عالم، محدث، مفسر اور فقیہہ کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ مجھے اس رائے کو بیان کرنے میں اب کوئی باک نہیں رہا اور مَیں اسے اعتماد کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

ان آیات کا تعلق ماہ رمضان کے روزوں سے نہیں بلکہ ان تین دن کے روزوں سے

ہے جن کی ہدایت نبی اکرم ﷺ نے دی تھی۔ اس میں چند رعایتیں بھی رکھی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ اگر ان تین دنوں میں بیمار ہو تو کوئی سے اور تین دنوں میں رکھ لو۔ اگر سفر پر ہو تو بعد میں ان کی قضا ادا کر سکتے ہو۔ ایک رعایت کا تعلق اسلام کی حکمت ِتشریعی سے ہے کہ لوگوں کو تدریجاً خوگر بنایا گیا ہے۔ چونکہ اہلِ عرب روزے سے واقف ہی نہیں تھے‘ وہ صوم کی عبادت جانتے ہی نہیں تھے‘ حضرت ابراہیم ں کی طرف منسوب کر کے وہ جن روایات کی پابندی کرتے تھے اور جسے وہ دین حنیف کہتے تھے‘ اس میں روزہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس روزہ سے مانوس کرنے کے لیے ابتدا میں یہ رعایت بھی رکھی گئی کہ اگر تم صحت مند ہونے کے باوجود اور مقیم ہونے کے باوصف روزہ نہ رکھو تو ایک مسکین کو کھانا کھلادو‘ یہ اس کا فدیہ بن جائے گا۔ اس کے بعد جب رمضان کے روزے والی آیت (آیت نمبر۱۸۵) نازل ہوئی تو پہلی دو رعایتیں تو علیٰ حالہٖ برقرار رہیں کہ اگر کبھی بیمار ہو یا مسافر ہو تو قضا کر سکتے ہو‘ تعداد بعد میں پوری کر لو‘ لیکن وہ جو تیسری مزید رعایت فدیہ ادا کرنے کی تھی‘ وہ ساقط ہو گئی۔

اس کے بارے میں امام رازیؒ نے یوں لکھا ہے (یہ فقہی اصطلاحات ہیں) کہ پہلے روزے کا وجوب ’’علی التّخییر‘‘ تھا کہ تمہیں اختیار ہے کہ روزہ رکھو یا اس کے فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلا دو‘ اب ’’علی التّعیین‘‘ ہو گیا کہ معیّن روزہ لازم ہے‘ فرض ہے جو ہر مسلمان کو رکھنا ہو گا۔ یہ ہے اصل میں تین آیات (آیات ۱۸۳‘ ۱۸۴‘ ۱۸۵) میں ربط کی ایک صورت‘ جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ سلف میں بھی یہ رائے موجود ہے اور ہمارے دَور میں حضرت انور شاہ کاشمیریؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

اب ہم ان آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ} ’’اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے۔‘‘ عام طور پر ’’صیام‘‘ کا ترجمہ ’’روزے‘‘ کر دیا جاتا ہے‘ یعنی جمع کے صیغہ میں‘ جو درست نہیں ہے۔ صیام دراصل صوم کی جمع نہیں ہے بلکہ مصدر ہے۔ صَامَ‘ یَصُوْمُ‘ صَوْمًا وصِیَامًا---- صوم اور صیام دونوں مصدر ہیں۔ جیسے قَامَ‘ یَقُوْمُ‘ قِیَامًا میں قیام مصدر ہے۔

صوم کا لغوی مفہوم

عربوں کے یہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے‘ اب ذرا اسے بھی سمجھ لیجیے! عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے‘ البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا پیشہ اکثر غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔

ان کاموں کے لیے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی۔یہ اس مقصد کے لیے نہایت قیمتی جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آجائیں۔ اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے۔ پھر وہ گھوڑے کے مقابلے میں تیزی سے اپنا رُخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ البتہ گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے گھوڑوں سے یہ مشقّت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے ۔ ان کے مُنہ پر ایک ''توبڑا'' چڑھا دیتے تھے۔ اس عمل کو وہ صوم کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے وہ صائم کہتے 'یعنی یہ روزہ سے ہے۔

اس طرح وہ گھوڑوں کو بھوک پیاس جھیلنے کا عادی بناتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فاقہ کشی برداشت نہ کرے اور جی ہار دے۔ اس طرح تو سوار کی جان شدید خطرہ میں پڑجائے گی اور اسے زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔ مزید یہ کہ عرب اس طور پر گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر موسم گرما اور لُو کی حالت میں انہیں لے کر میدان میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور جسم پر کپڑے وغیرہ لپیٹ کر ان گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہتے اور ان گھوڑوں کا مُنہ سیدھا لُو اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے تاکہ ان کے اندر بھوک پیاس کے ساتھ لُو کے اُن تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی بھی عادت پڑ جائے 'کسی ڈاکے کی مہم یا قبائلی جنگ کے موقع پر گھوڑا اپنے سوار کے قابو میں رہے اور بھوک پیاس یا بادِ صرصر کے تھپیڑوں کو برداشت کرکے مطلوبہ رُخ برقرار رکھے اور اس سے منہ نہ پھیرے۔

چنانچہ عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جو مشقت کراتے تھے اور جس پر وہ

صوم یعنی روزہ کا اطلاق کرتے تھے' اس مشق کے متعلق گویا اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے گھوڑوں کو تم جو روزہ رکھواتے ہو' وہ تم خود بھی رکھو۔ تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: {كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ} ''تم سے پہلے جو اُمتیں تھیں' جیسے ان پر روزہ فرض کیا گیا تھا ویسے ہی تم پر بھی فرض کیا گیا ہے۔'' چونکہ عرب کے لوگ روزے کے عادی نہیں تھے تو پہلی بات سمجھانے کے انداز میں فرمائی گئی کہ یہ تمہارے لیے کوئی نیا حکم 'کوئی نئی مشقت نہیں ہے۔ یہ حکم پہلی اُمتوں کو بھی مل چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا فرضیت کے لحاظ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد' زمانہ اور آداب و شرائط کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سابقہ انبیاء ورُسل علیہم السلام کی شرائع میں فرق رہا ہے۔

روزے کا مقصود: حصولِ تقویٰ

دوسری بات یہ سمجھائی گئی کہ تمہیں اس مشقت و تکلیف میں ڈال کر اللہ تعالیٰ کو کوئی مسرت حاصل نہیں ہوتی' معاذ اللہ ! اس میں تمہارے ہی لیے مصلحت ہے۔ اور وہ ہے: {لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾} ''تاکہ تم میں

تقویٰ پیدا ہو جائے۔ ''تقویٰ کے معنی اور مفہوم کو جان لینے سے یہ مصلحت اور حکم بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ ''تقویٰ'' کے معنی ہیں ''بچنا''۔ قرآن مجید نے اس میں اصطلاحی مفاہیم پیدا کیے 'یعنی اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' حرام سے بچنا' معصیت سے بچنا تقویٰ ہے۔

ہمارے نفس کے بہت سے تقاضے ہیں۔ مثلاً پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی حلال چیز کھانے کو نہیں ہے تو اگر کوئی مسلمان بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو جائے تو حرام میں منہ مار بیٹھے گا۔ لہٰذا اس کو یہ عادت ڈالی جائے کہ آخری حد تک بھوک پر قابو پانے میں کامیاب رہے۔ اسی طرح پیاس کو کنٹرول میں لائے' شہوت کو کنٹرول میں رکھے۔ ساتھ ہی نفس کی اُن خواہشات پر قابو پانے کی مشق حاصل ہو جو دین کے منافی ہوں۔ لہٰذا طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور تعلقِ زَن و شو سے کنارہ کش ہونے کی جو مشق کرائی جاتی ہے اس کا مقصد ضبطِ نفس ہے' تاکہ ایک بندۂ مؤمن کو اپنے نفس کے منہ زور گھوڑے کے تقاضوں پر قابو پانے اور اسے کنٹرول میں رکھنے کی مشق ہو جائے اور عادت

پیدا ہو جائے۔ یہ ساری گفتگو خاص طور پر پورے رمضان المبارک سے متعلق ہے۔

ہماری تقویم قمری ہے جس کے نویں مہینے کو رمضان کہا جاتا ہے۔ ہر برس قمری اور شمسی سال میں دس گیارہ دن کا فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ قمری مہینوں اور شمسی مہینوں کے موسموں میں مطابقت نہیں ہوتی۔ لہٰذا قمری تقویم کے مطابق گھوم پھر کر رمضان کا مہینہ سال کے ہر موسم میں آتا رہتا ہے۔ مئی سے جولائی تک ہمارے ملک کے اکثر و بیشتر علاقوں میں شدید گرمی پڑتی رہتی ہے۔ ایسے گرم موسم میں پیاس سے حلق میں جو کانٹے چبھتے ہیں' اس کا عملی تجربہ خاص طور پر روزہ رکھنے کے بعد ہوتا ہے۔ چاہے سامنے بہترین مشروبات موجود ہوں' اگر آپ روزے سے ہیں تو ان کو پی نہیں سکتے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ کھانے کی مرغوب چیزیں موجود ہیں' لیکن بھوک اور نقاہت کے باوجود نہیں کھا سکتے' اس لیے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ اسی طریقہ سے بیوی موجود ہے۔ دن میں اپنی شہوت کو جائز طور پر پورا کیا جا سکتا ہے' لیکن نہیں کرتے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ممانعت کر رکھی ہے۔ اب سوچیے کہ ایک مقررہ وقت سے دوسرے مقررہ وقت تک آپ اگر اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزیں پورے تیس دن اس لیے استعمال نہیں کر رہے کہ اللہ نے اس کی اجازت نہیں دی 'تو اس سے آپ کے اندر ایک مضبوط قوتِ ارادی کے ساتھ یہ استطاعت اور استعداد پیدا ہونی چاہیے کہ بقیہ گیارہ مہینوں میں بھی تقویٰ کی روش پر مستقیم رہیں۔ لہٰذا پورے رمضان کے روزے دراصل تقویٰ کی مشق ہے۔ صوم کی فرضیت کے ساتھ ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' ایک چھوٹا سا فقرہ ہے' لیکن غور و تدبر کیا جائے تو یہ دو لفظی جملہ بڑا ہی پیارا' نہایت عجیب اور بڑی جامعیت کا حامل ہے۔ اس کے اندر روزے کی ساری ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی فضیلتیں آگئیں۔ یہ بات روزِ

روشن کی طرح مبرہن ہو گئی کہ روزے کا مقصود حصولِ تقویٰ ہے' بالخصوص نفس کا تقویٰ یعنی اللہ کی محبّت کے شوق اور اس کی نا فرمانی کی سزا کے خوف سے اللہ کے اوامرونواہی پر استقلال کے ساتھ مستقیم رہنے کے لیے اپنے نفسِ امّارہ کو قابو میں رکھنے کی تربیت حاصل کرنا۔ اس کے لیے ہمارے دین کی معروف و جامع اصطلاح ہے ''تزکیہ۔''

روزہ اورروحِ انسانی

بات سمجھانے کے لیے اگر دَورِ جدید کے مشہور ماہر نفسیات فرائڈ کی اصطلاحات استعمال کروں تو وہ یوں ہو گا کہ اپنی id یا libidoکو کنٹرول میں رکھنے کی مشق۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ انسانی شخصیت کی تین سطحیں ہیں۔ سب سے نچلی سطح کے لیے وہ id یا libidoکی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یعنی شہوانی' نفسانی' حیوانی تقاضے اور داعیات۔ دوسرے egoیعنی مَیں' انا' انانیت یا خودی۔ تیسرےsuper egoیعنی انائے کبیر۔ اس سے مراد اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ اگر خودی کمزور ہے تو انسان اپنے حیوانی نفس کا تابع ہے اور اگر خودی مضبوط ہے تو یہ ضبطِ نفس کا کام کرے گی۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اگر آپ گھوڑے پر سوار ہیں اور باگیں کمزور ہیں تو گھوڑا آپ پر حاوی ہے' وہ جب چاہے گا آپ کو پٹخ دے گا یا آپ کو اپنی مرضی سے جدھر چاہے گا لے جائے گا۔ اگر آپ قوی ہیں اور گھوڑے پر قابو یافتہ ہیں تو یہ گھوڑا آپ کا مطیع ہے' آپ جدھر جانا چاہیں گے وہ آپ کو لے جائے گا۔ تو جس طریقہ سے راکب اور مرکب کا معاملہ ہے' یعنی انسان جو گھوڑے پر سوار ہے اور گھوڑا جو انسان کی سواری ہے' اسی طرح ہماری خودی اور ہمارے نفس کا معاملہ ہے۔ ہماری خودی راکب ہے اور نفس اس کا مرکب۔ خودی کمزور ہو گی تو نفس کے بس میں آجائے گی۔ نفس جو چاہے گا' حکم دے گا اور پورا کرائے گا۔ گویا ہم اس کے تابع ہیں اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔ اگر خودی مضبوط ہے' انا مضبوط ہے اور نفس پر قابو یافتہ ہے تو یہ نفس انسان کے لیے نیکیاں' بھلائیاں اور خیر کمانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

غیبت' جھوٹ' فحش باتیں' بدزبانی اور دل آزاری وغیرہ قسم کے گناہوں سے بچنے کی قرآن و حدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ حدیث شریف میں خاص طور پر روزے کی حالت میں ان گناہوں سے بچنے کی مزید تاکید آئی ہے کہ اگر روزے دار نے ان گناہوں سے اجتناب نہیں کیا تو اس روزے سے محض فاقے اور رات کے قیام میں محض رت جگے کے سوا اُس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اس ضمن میں چند احادیثِ شریفہ مَیں ان شاء اللہ آگے بیان کروں گا۔ اب پھر متن کی طرف رجوع کیجیے۔ پہلی آیت واضح ہو گئی:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾}

’’اے اہلِ ایمان! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں (اُمتوں) پر فرض کیا گیا تھا‘ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے (تم متقی بن جائو)۔‘‘

رمضان المبارک: نزولِ قرآنِ حکیم کا مہینہ

اگلی آیت اسی کا ضمیمہ یا تشریح ہے۔ اس میں تمہید ہے کہ گھبراتے کیوں ہو‘ گنتی کے چند دن ہی تو ہیں! یہاں جو لفظ ’’مَعۡدُوۡدَات‘‘ آیا ہے‘ تو اس وزن پر جمع قلت آتی ہے‘ جس کا اطلاق نو سے کم پر ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ دلیل ملتی ہے کہ یہ یقیناً ایامِ بیض کے تین روزوں سے متعلق ابتدائی حکم ہے۔ انتیس یا تیس دن کے روزے تو ’’ایّام معدودات‘‘ شمار نہیں ہو سکتے‘ ان کو گنتی کے دن تو نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ یہ بھی درحقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ وہی رائے قوی ہے کہ ابتدا میں جو تین دن کے روزے فرض کیے گئے تو وہ انسان کے نفس پر اتنے بھاری گزرنے والے نہیں تھے۔ لہٰذا ہمت دلانے‘ ڈھارس بندھانے اور تسلی دینے کے لیے فرمایا: {اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ} ’’گنتی کے چند دن ہی تو ہیں!‘‘

پھر اس میں مزید رعایت بیان فرمائی: {فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ} ’’پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ تعداد پوری کرلے دوسرے دنوں میں۔‘‘ آگے فرمایا: {وَ عَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ} ’’اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو ان کے ذمہ (ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔‘‘ اس رعایت کا تعلق بھی ایامِ بیض کے روزوں سے تھا۔ آگے تشویق دلائی: {فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ} ’’پھر جو اپنی خوشی سے زیادہ نیکی کمائے تو یہ اُس کے حق میں بہتر ہے۔‘‘ اس کے معنی یہ ہوئے کہ روزہ بھی رکھو اور ایک مسکین کو کھانا بھی کھلائو تو کیا کہنے! یہ نورٌ علیٰ نُور والا معاملہ ہو گا۔ آگے ارشاد ہوا: {وَ اَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾} ’’اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو۔‘‘ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ رعایت

خصوصی ہے‘ ورنہ پسندیدہ یہی ہے کہ ایک مسکین کو روزے کے فدیہ کے طور پر کھانا کھلانے کی بجائے خود روزہ رکھو۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تم کو رعایت تو دی ہے‘ لیکن اگر تم سمجھ سے کام لو تو تم خود جان لو گے کہ روزے میں کتنی حکمت‘ مصلحت اور برکت ہے۔ اس کی کیا عظمت ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں! اگر تم یہ سب سمجھ لو گے تو یقیناً تم روزہ ہی رکھو گے۔

اب آگے اس نوع کی تیسری آیت آتی ہے جو کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی‘ لیکن مضمون کی مناسبت سے اس کو اور بقیہ تین آیات کو اسی مقام پر شامل کر دیا گیا۔ جیسے سورۃ المزمل مکی سورت ہے‘ لیکن اس کا دوسرا رکوع جو

صرف ایک آیت پر مشتمل ہے‘ بعد میں مدنی دَور میں نازل ہوا ‘اور مضمون کی مناسبت سے یہ آخری آیت سورۃ المزمل کے ساتھ شامل کر دی گئی۔ اسی طریقے سے یہاں زمانی اعتبار سے اگلی آیت اور پچھلی دو آیات میں بعد ہے‘ لیکن موضوع کی مناسبت سے اسے پہلے حکم کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔

اب اگلی آیت کے مطالعہ کی طرف توجہات کو مبذول فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے: {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ} ’’رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔‘‘ {هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ} ’’جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔‘‘ یعنی اسے لوگوں کے لیے ہدایت و راہنمائی بنا کر نازل کیا گیا ہے۔ یہ ہدایت و راہنمائی گنجلک‘ مبہم یا پہیلیوں کے انداز میں نہیں بلکہ بڑی روشن‘ بہت واضح اور حق و باطل میں تمیز کردینے والے کھلے اور مضبوط دلائل کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن حکیم کی متعدد شانوں میں سے یہ تین اہم ترین شانیں یہاں بیان ہوئیں کہ یہ صحیح راہ کی طرف راہنمائی کرنے والی کتاب ہے‘ یہ بینات پر مشتمل ہے اور یہ حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب ہے۔ آگے فرمایا: {فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ} ’’پس جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو اُس پر لازم ہے کہ وہ اس ماہ کے روزہ رکھے۔‘‘ یہاں کلمہ ’’ف‘‘ دونوں جگہ فرضیت کا فائدہ دے رہا ہے۔ اب یہ

صومِ رمضان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ’’شُھودُ الشّھر‘‘ کے الفاظ نہایت قابلِ توجّہ ہیں‘ یعنی رمضان کے مہینے کا پا لینا۔ کرۂ ارض پر ایسے منطقے بھی ہیں جہاں چاند شروع مہینہ میں ظاہر ہی نہیں ہوتا‘ جس طرح ایسے خطے بھی ہیں جہاں سورج ہی طلوع نہیں ہوتا یا برائے نام طلوع ہوتا ہے اور وہاں پر گھڑی کے حساب سے نماز ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں تقویم (جنتری) سے حساب کر کے رمضان کے مہینے کے روزے رکھنے فرض ہوں گے۔ ’’شُھودُ الشّھر‘‘ میں یہ بات شامل ہے۔ یہ اعجازِ قرآنی ہے کہ یہ ایسے الفاظ لاتا ہے جن سے استدلال کر کے ہر منطقے اور خطے کے مسائل کے لیے حل نکالے جا سکتے ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ کہ روزوں کے لیے کوئی سا بھی مہینہ چُنا جا سکتا تھا۔ روزے جس مہینے میں بھی رکھے جاتے‘ ضبطِ نفس کی مشق کا مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ ان روزوں کے لیے ماہِ رمضان کا انتخاب کیوں ہوا؟ اس کا جواب شروع ہی میں دے دیا گیا: {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ} ’’رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے‘‘۔ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے‘ جس میں دن کے روزے کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے قیام اللیل کو تطوّع اور مجعول من اللہ قرار دیا ہے‘ جیسا کہ ہم حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت میں پڑھ آئے ہیں۔

صیام و قیام: لازم و ملزوم

قیام اللیل کی اہمیت کو جاننے کے لیے اُمّت کے دو جلیل القدر ائمہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ سے مروی وہ حدیث بھی ملاحظہ کیجیے جو صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔ کتب احادیث میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا جو مقام و مرتبہ ہے' کوئی ایسا شخص اس سے ناواقف اور لاعلم نہیں رہ سکتا جو دین سے تھوڑا بہت بھی شغف رکھتا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ)) (متفق علیہ)

''جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان اور احتساب کے ساتھ' بخش دیے

گئے اُس کے تمام سابقہ گناہ' اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان اور احتساب کے ساتھ' بخش دیے گئے اُس کے جملہ سابقہ گناہ۔''

(احتساب سے مراد ہے اللہ تعالیٰ سے ثواب کی نیت اور اُس کی خوشنودی کا حصول۔)

صحیحین کی اس حدیث کی رو سے صیام اور قیام بالکل ہم وزن اور متوازی و مساوی ہو گئے !

روزہ اور قرآن کی شفاعت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کو امام بیہقی رحمہ اللہ علیہ نے ''شعب الایمان'' میں روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ: اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ' فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ، وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ' فَیُشَفَّعَانِ))

''روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا)۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے رب ! مَیں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پوری کرنے سے روکے رکھا تھا' آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما) ! اور قرآن کہے گا: مَیں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا' پروردگار ! آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما) ! چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی۔ (اور اس کے لیے جنّت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا اور خاص مراحم خسروانہ سے اسے نوازا جائے گا۔)''

اس حدیث شریفہ سے یہ بات بالکل منقح اور مبرہن ہو گئی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جس قیام کا ذکر ہے' اس سے اصل مراد اور اس کا اصل مدّعا و منشا

یہ ہے کہ رمضان کی راتیں یا ان کا زیادہ سے زیادہ حصّہ قرآن مجید کے ساتھ بسر کیا جائے۔ یقیناً اب آپ لوگ سمجھ لیں گے کہ میری اس رائے کی بنیاد کیا ہے کہ پوری رات قرآن کے ساتھ بسر ہونی چاہیے۔ اس حدیث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ افضل عمل یہ ہے کہ رمضان کی پوری رات قرآن مجید کے ساتھ گزرے۔

اس حدیث شریفہ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ صیام و قیام کا ہم وزن اور متوازی معاملہ ہے کہ نہیں؟ روزے میں آپ جتنا وقت گزارتے ہیں' اس نقطۂ نظر سے صیام و قیام کے متوازی الفاظ کا کیا یہ تقاضا نہیں ہے کہ جس طرح دن روزے کی حالت میں گزرا ہے ' اُسی طرح رات قرآن کے ساتھ گزاری جائے؟ قرآن کی تلاوت قیام یعنی صلوٰۃ کے ساتھ افضل ترین ہے جبکہ بیٹھ کر اس کا مطالعہ بھی بہت با برکت ہے۔ یہی معاملہ اس متفق علیہ روایت کا بھی ہے جس کا مطالعہ ہم نے اس حدیث سے قبل کیا ہے'جس میں ایمان و احتساب کے ساتھ صیام و قیام پر نبی اکرم ﷺ نے تمام پہلے گناہوں کی مغفرت کی بشارت دی ہے۔ پس ان احادیث سے دین کی روح یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر واقعتاً اس ماہ مبارک کی برکتوں اور عظمتوں سے استفادہ کا عزم اور ارادہ ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ دن کا روزہ ہو اور پوری پوری رات قرآن کے ساتھ بسر ہو۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے یہ نرمی رکھی ہے کہ اسے فرض نہیں کیا۔

ہمارے یہاں یہ روایت جاری رہی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ علیہ کی خانقاہ کے متعلق میرے علم میں یہ بات ہے کہ ان کی حیات میں وہاں پورے رمضان المبارک کے دوران تراویح میں دو ہزار سے تین ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے یا نہیں ! وہاں کا معمول یہ نہیں تھا جس کے ہم عادی ہیں کہ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں بیس تراویح اور بعد کے تین وتر پڑھے اور فارغ ہو گئے' بلکہ خانقاہ میں ہر چار رکعات تراویح کے بعد آدھا آدھا گھنٹہ ' پون پون گھنٹہ وقفہ ہوتا تھا' جس میں لوگ مختلف اشغال میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگ اَذکار و اوراد میں لگ جاتے تھے' کچھ علیحدہ علیحدہ ٹکڑیوں میں بٹ جاتے تھے جن میں وعظ و نصیحت ہوتی تھی' کچھ لوگ

قرآن مجید سے اس متن کی تلاوت کر رہے ہوتے جو اگلی چار رکعتوں میں پڑھا جانا ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر کھڑے ہو کر اگلی چار رکعتیں پڑھی جاتیں۔ ہر تراویح کے دوران پورے رمضان میں یہ دستور رہتا تھا۔ اس طرح ساری رات قرآن مجید اور ذکر و وِرد میں گزرتی تھی۔ یہ اس نقشہ پر عمل کی ایک صورت ہے جو ان دو احادیث کے مطالعہ سے

سامنے آتا ہے۔ اگر خلوص و اخلاص اور للہیت کے ساتھ یہ عمل ہو تو جو لوگ یہ کام کریں ' شاید وہ ان بشارتوں کے مستحق بن جائیں جو اِن دو حدیثوں میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش بختوں میں شامل فرمائے جن کا ذکر ان احادیث میں ہے !

رمضان المبارک میں فرضیت ِ روزہ

اب پھر آیت ۱۸۵ کی طرف رجوع کیجیے ! رمضان کے روزے کے لیے حکم آیا کہ تم میں سے جو بھی اس مہینہ میں موجود ہو وہ لازماً روزہ رکھے۔ یعنی اب پورے ماہ کے روزوں کی فرضیت کا حکم آگیا۔ ایامِ بیض کے روزوں کے لیے جو دو رعایتیں تھیں وہ برقرار ہیں: {وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ} '' اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) گنتی پوری کرلے۔'' البتہ وہ رعایت جو ایامِ بیض کے حکم کے ساتھ دی گئی تھی کہ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے' اسے منسوخ اور ساقط کر دیا گیا۔یہ بات سمجھ لیجیے کہ اس رعایت کو قرآن مجید نے منسوخ و ساقط کیا ہے' لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص حالات میں اس کو قائم رکھا ہے۔ جیسے کوئی شخص بہت بوڑھا ہو گیا ہو اور اب اس میں روزہ رکھنے کی بالکل استطاعت ہی باقی نہ رہی ہو' کوئی دائمی مریض ہو جسے اب شفا کی کوئی توقّع ہی نہ رہی ہو۔ مثلاً کوئی ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج میں ہے یا کوئی ذیابیطس کا دائمی مریض ہو گیا ہے اور اس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی پر ایسے مختلف عوارض و امراض کو قیاس کر لیجیے۔ ایسے لوگوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے یہ رعایت برقرار رکھی ہے کہ وہ فی روزہ ایک مسکین کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں۔ کھانے کی جگہ اناج کی مقدار اور چند دوسری شرائط کا بھی تعیّن کیا گیا ہے۔ الغرض خاص حالات میں اس رعایت کو حضور ﷺ نے باقی رکھا ہے۔

اہلِ سُنّت کے نزدیک یہ بات اصولاً طے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ اختیار ہے کہ آپؐ قرآن کے خاص کو عام اور قرآن کے عام کو خاص کر سکتے ہیں' قرآن کے حکم پر اضافہ فرما سکتے ہیں اور قرآن کے حکم کی تبیین میں مزید حکم دے سکتے ہیں۔ یہ منکرینِ سُنّت کی گمراہی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی سُنّت اور آپؐ کے احکام کو دین میں حُجّت نہیں مانتے۔ بعض احادیث ِ صحیحہ میں بصراحت آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ نہ سمجھنا کہ کھانے پینے کی صرف وہی چیزیں حرام ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہے' کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کی حرمت کا مَیں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔'' یا جیسے قرآن مجید میں حکم آیا ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ حضور ﷺ نے اسے مزید عام کر دیا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ یہ چند مثالیں اس لیے دی گئی ہیں کہ اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ اشکال ہو کہ حضور ﷺ نے بوڑھوں اور دائمی مریضوں کے لیے رمضان کے روزے کے فدیہ کو برقرار کیسے رکھا' تو وہ اشکال رفع ہو جائے۔ یہ

بات واضح ہو جائے کہ یہ چیزیں رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں شامل ہیں اور ان کا آپکو حق حاصل ہے۔

آگے فرمایا: {یُرِیدُ اللہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ} ''اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ دشواری و سختی نہیں چاہتا۔'' یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے مقصود اللہ کو بندوں کے حق میں آسانیاں فراہم کرنا ہے نہ کہ دشواریاں' سختیاں اور تنگیاں۔ لہٰذا بیماری یا سفر کی وجہ سے جو روزے قضا ہوجائیں' بعد میں ان کی تکمیل کر لو۔ یہ نیکی اور تقویٰ کا غلط تصوّر ہے کہ ایک سو چار ڈگری کا بخار ہے اور روزہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ سفر پر جارہے ہیں اور روزوں کا اہتمام والتزام بھی ہو رہا ہے۔ یہ درحقیقت اپنے اوپر تشدد اور ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رعایتیں دی ہیں' آپ ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ اکثر لوگوں کو خوامخواہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ آج کل کا سفر کون سا مشکل ہے! آپ کراچی سے لاہور کے لیے ریل میں چلیں اور راستہ میں گاڑی کسی معمولی پلیٹ فارم پر پانچ چھ گھنٹے کے لیے رک

جائے تو اب آپ کیا کریں گے؟ اسی پر قیاس کر لیجیے کہ آج کل کے سفر میں بھی کس طرح کی تکالیف آسکتی ہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے رعایت دی ہے تو کسی کے اس سے استفادہ کرنے کو ہرگز گھٹیا بات نہ سمجھیے' بلکہ اس کے لیے اصول دے دیا گیا۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ((یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا)) (متفق علیہ: عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ) ''لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو' سختی اور تنگی پیدا نہ کرو!''

صحیح احادیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک سفر پر جا رہے تھے۔ دیکھا کہ کچھ لوگ بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے! بتایا گیا کہ یہ لوگ روزے سے تھے اور دھوپ کی تمازت سے ان پر غشی طاری ہو گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ)) (رواہ النسائی: عن ابی مالک الاشعری رضی اللہ عنہ) ''سفر میں روزہ رکھنا نیکی کی بات نہیں ہے!'' یہ درحقیقت اپنے اوپر تشدد ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے۔ جہاں رعایت دی گئی ہے وہاں اس رعایت سے فائدہ اٹھائیے۔ ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ بلاغتِ قرآنی کا یہ ایک عام اسلوب ہے۔ لہٰذا آیت کے اس حصّہ میں بیان کردہ 'یُسر و عُسر' کا معاملہ صرف صیام پر موقوف نہیں ہے۔ ہر حکم کی تہ میں بندوں کے حق میں رحمتیں اور مصلحتیں ہی ملیں گی۔ جہاں کوئی دشواری یا معذوری پیش آئے وہاں کوئی نہ کوئی مناسب و متناسب رعایت یا رخصت رکھ دی گئی ہے۔

اب آیت کی طرف پھر رجوع کیجیے کہ {یُرِیدُ اللہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۫} کے فوراً بعد فرمایا: {وَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ} یہ رعایتیں ہیں' لیکن چھوٹ نہیں ہے۔ یہ اس لیے رکھی گئی ہیں تاکہ بعد میں تم تعداد پوری کر لو۔ تعداد بہرحال پوری کرنی پڑے گی۔ یہ نہیں ہے کہ آپ فدیہ دے کر روزہ رکھنے سے بچ جائیں۔ یہاں صیغہ امر کا ہے۔ {وَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ} یہاں حرفِ ''ل'' لامِ تاکید و لزوم ہے۔ یعنی لازم ہے کہ بعد میں تعداد پوری کرو۔ آگے فرمایا: {وَ لِتُکَبِّرُوا اللہَ عَلٰی

مَا ہَدٰىکُمْ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿ ۱۸۵ ﴾ } ''اور تا کہ تم اپنے ربّ کی تکبیر کرو (اُس کی کبریائی کا اظہار کرو) اس پر کہ جو اُس نے تمہیں

راہِ راست دکھائی (جو ہدایت تمہیں عطا فرمائی) اور تم شکرگزار بن کر رہو۔''

یہ تکبیر کیا ہے اور یہ شکر کیا ہے؟ وہ یہ کہ تم کو اندازہ ہو' آگہی ہو' شعور و ادراک ہو کہ یہ قرآن اللہ کی کتنی عظیم نعمت اور کتنی بڑی دولت ہے ! اس نعمت اور دولت کی صحیح قدرو قیمت کا اندازہ کب اور کیسے ہو گا' یہ بات سطوت و عظمتِ قرآن مجید سے متعلق ہے۔

غور و فکر کا اہم نکتہ

ہمارے غور و فکر کے لیے اس آیت میں ایک اہم نکتہ ہے۔ اس مقام پر قرآن مجید کو ''ھُدًی لِّلنَّاس'' فرمایا گیا ہے' یعنی اسے تمام انسانوں کے لیے ہدایت قرار دیا گیا ہے' لیکن سورۃ البقرۃ کے بالکل آغاز میں اسی قرآن کے متعلق فرمایا جاتا ہے: ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہ ''یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے''۔ ان دونوں باتوں میں ربط و تعلق کو سمجھنا ہو گا۔ قرآن مجید میں بذاتہٖ اور فی نفسہٖ تو ہدایت کا سامان پوری نوعِ انسانی کے لیے موجود ہے' لیکن اس سے ہدایت وہی حاصل کرے گا جس میں تقویٰ کی کچھ نہ کچھ رمق اور تلاشِ حق کی کچھ نہ کچھ طلب موجود ہو۔ یہ چیز ابوجہل میں نہیں تھی' چنانچہ وہ خالی رہا' قرآن کی ہدایت سے استفادہ نہیں کر سکا اور اس سے محروم رہا۔ ابولہب کیوں محروم رہا؟ اس لیے کہ اس میں بھی تقویٰ کی نہ کوئی رمق تھی اور نہ ہی خدا ترسی کا مادّہ تھا۔ گویا ہدایت کی طلب ہی موجود نہیں تھی۔ تو جب تک طلب موجود نہ ہو' کوئی استفادہ کیسے کرے ! جب تک پیاس نہ لگے اُس وقت تک پانی کی قدرو قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔پیاس لگی ہوئی ہو اور پھر پانی کا ایک گھونٹ ملے تو معلوم ہو گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر پیاس کے باعث جان پر بنی ہو تو بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ایک گھونٹ پانی کے عوض اپنی پوری سلطنت دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ شدید بھوک لگی ہوئی ہو تو سوکھی روٹی بھی پراٹھا معلوم ہو گی' لیکن اگر بھوک نہیں تو چاہے مرغوب ترین غذا سامنے ہو اس کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہو گی۔ پس جب تک طلب نہ ہو اُس وقت تک کسی شے کی قدرو قیمت کا احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ طلب پیدا کرنے کے لیے تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

اس روزے سے تمہارے اندر تقویٰ اُبھرے گا۔ اس تقویٰ کی پونجی کو لے کر رات کو

اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہو جاؤ اور اب تمہارے قلب پر اس قرآن کا نزول ہو۔ یہ جاں فزا بارانِ رحمت جب تم پر برسے گی تب تم کو احساس ہو گا کہ یہ کتنی عظیم نعمت 'کتنی بڑی دولت اور اللہ کا کتنا بڑا انعام و احسان ہے کہ

اس نے ہمیں یہ کلام پاک عطا فرمایا۔ کلام، متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ ہماری اصوات اور حروف و الفاظ میں مصحف کے اندر لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام ہمارے سامنے ہے۔ اس قرآن کے ذریعہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہم سے کلام فرما رہا ہوتا ہے اور ہم اس سے مناجات کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جو بڑے پیارے اور دل نشین الفاظ میں علامہ اقبال نے ان اشعار میں کہی ہے: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است

ایں کتاب نیست چیزے دیگر است !

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود !

مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں

زندہ و پائندہ و گویا ست ایں !

'' اس کتاب کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے، اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں ! حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں، کچھ اور ہی شے ہے ! یہ کتابِ حکیم جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے، اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے ! یہ ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے، لہٰذا اُسی کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی، اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی۔''
روح کی غذا : قرآن حکیم

قرآن عظیم کی عظمت کا اگر کچھ اندازہ کرنا ہو تو اس تمثیل پر غور لیجیے جو سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے: {لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ

اللّٰہِ } ''اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا (اور انسان کی طرح اس میں سمجھنے کا جوہر رکھا ہوتا) تو تم دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔''{وَتِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾} ''اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ (اپنے رویہ اور اپنی حالت پر) غور و فکر کریں۔'' اب وہ مساوات (equation) مکمل ہو گئی کہ قرآن مجید سے استفادہ کے لیے شرطِ لازم بھی تقویٰ ہے اور روزے کا مقصد بھی تقویٰ ہے۔ لہٰذا دن کو روزے سے تقویٰ حاصل کیجیے اور رات کو قرآن کی بارش اپنے اوپر برسائیے' تا کہ آپ کے اندر جو روحِ ملکوتی ہے وہ اس سے نشوونما حاصل کرے۔ وہ روح جو اللہ نے پھونکی تھی' ازروئے الفاظِ قرآنی:{وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ} (الحجر:۲۹)

پس ہمارا ایک حیوانی وجود ہے اور ایک روحانی وجود ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیواں!

اس روحانی وجود سے ہم غافل رہتے ہیں جبکہ حیوانی وجود کی بابت ہمیں ہر شے کی خبر ہے۔پیٹ کھانے کو مانگتا ہے تو دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ کوئی اور تقاضا اُبھرتا ہے تو اس کو پورا کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ لیکن روح سے غفلت رہتی ہے۔ وہ بے چاری سسکتی رہتی ہے' کمزور اور لاغر ہوتے ہوتے بے جان ہو جاتی ہے۔ اس رمضان نے یہ کیا کہ عام دنوں کے عمل کو پلٹ دیا۔ اس حیوانی وجود یعنی جسم کے تقاضوں کو ذرا دبائو' ان میں کمی کرو۔ دن میں بطن وفرج کے تقاضوں پر پابندیاں اور قدغنیں لگائو۔ رویّہ ' اَخلاق اور معاملات میں خاص طور پر چوکس اور چوکنے رہو۔ ان کے ضمن میں دین کے اوامرونواہی پر شعوری طور پر عمل پیرا رہو ۔ اللہ تعالیٰ نے آسودگی اور خوش حالی دی ہے تو ہاتھ کو مزید کشادہ کرو۔ حاجت مندوں' مسکینوں اور فقراء کے زیادہ سے زیادہ کام آئو تا کہ حیوانی جبلّتوں کا بوجھ روح پر سے کم ہو۔ پھر روح کی غذا کی طرف شعوری طور پر متوجّہ ہو جائو' اور وہ روحانی غذا کلامِ ربّانی ہے۔

بات کو مزید سمجھ لیجیے۔ ہمارا جسم کہاں سے بنا؟ مٹّی سے ! {مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا

نُعِيْدُكُمْ} (طٰہٰ:۵۵) ''اسی (مٹّی) سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے۔'' یہ جسدِ خاکی زمین سے آیا ہے' چنانچہ اس کی غذا بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہماری تمام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی زمین سے ہوتی ہے۔ بطورِ مثال غذا اورخوراک کو لے لیجیے۔ وہ کہاں سے آتی ہے؟ گندم اور دوسری اجناس کہاں سے آتی ہیں؟ گوشت کہاں سے بنا ہے؟ اس بکری نے بھی تو زمینی نباتات ہی کھائی ہیں جن سے گوشت بنا۔ یہی دودھ کا حال ہے۔ الغرض ہمارے وجودِ حیوانی کے لیے ساری ضروریات وہیں سے فراہم ہوتی ہیں جہاں سے ہمارا یہ وجودِ حیوانی خود آیا ہے۔ جو ہماری روحِ ربانی ہے' روحِ ملکوتی ہے' یہ اس عالمِ خاکی کی شے نہیں ہے۔ یہ عالمِ ناسوت سے متعلق نہیں ہے' عالمِ علوی سے ہے۔ {اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ} یہ روح عالمِ ملکوت سے آئی ہے' اسی کی طرف اسے لوٹنا ہے۔ یہ رُوح امرِ ربّ ہے۔{قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ}(بنی اسراء یل:۸۵) ''(اے نبی ﷺ !) کہہ دیجیے کہ یہ روح میرے ربّ کے امر سے ہے۔'' امرِربّ کی تقویت کا سامان کلامِ ربّ ہے۔ وہ بھی وہیں سے آیا ہے۔

ایک بڑی پیاری حدیث ملاحظہ کیجیے' اس میں نبی اکرم ﷺ نے عظمت و مقامِ قرآن اور اس کے حبل اللہ ہونے کی حیثیت کو بیان فرمایا ہے۔ معجم طبرانی کبیر میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر حضور ﷺ اپنے حجرۂ مبارک سے برآمد ہوئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ مسجدِ نبویؐ کے ایک کونے میں کچھ لوگ بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر بشاشت اور خوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضور ﷺ ان کے پاس چل کر تشریف لے گئے اور ان صحابہ کرام ث سے سوال کیا: ((اَلَیْسَ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَّ الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِاللّٰہِ !)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ؟ اور یہ کہ مَیں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' حضرت جبیرؓ آگے روایت کرتے ہیں: قُلْنَا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ''ہم نے عرض کیا:

یقیناً ایسا ہی ہے اے اللہ کے رسول!'' حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کی اس تصدیق و شہادت کے بعد فرمایا: ((فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ)) ''پھر تو خوشیاں منائو' اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' آگے ارشاد ہوا: ((فَتَمَسَّکُوْا بِہٖ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَھْلِکُوْا وَلَنْ تُضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا)) ''پس اسے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو! (اگر تم نے ایسا کیا) تو اس کے بعد تم نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ کبھی گمراہ۔'' اس حدیث شریف میں گویا حبل اللہ کی شرح موجود ہے کہ یہ قرآن حکیم ہے۔

اس حدیث کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث اور شامل کرلی جائے تو قرآن مجید کے حبل اللہ ہونے کی بات بالکل واضح اور مبرہن ہو جائے گی۔ آپ ؓ روایت کرتے ہیں: قال رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: ((کِتَابُ اللّٰہِ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) ''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔''

بہرحال اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ قرآن مجید' یہ کلامِ ربّانی روح کے تغذیہ و تقویت کا سبب ہے۔ جب اس روح کو اس کی اصل غذا ملے گی تو وہ اس سے از سرِ نو قوی اور توانا ہو کر اللہ کی طرف متوجّہ ہو گی اور ''اپنے مرکز کی طرف پرواز'' کا نقشہ پیش کرے گی ۔پھر تمہارے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کے شکر کا چشمہ ابل پڑے گا۔ اس شکر کا نتیجہ کیا نکلے گا' اس کا بڑا پیارا بیان اگلی آیت (نمبر ۱۸۶) میں ہے۔

روزہ اور دُعا

فرمایا: {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ} ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو (آپؐ کہہ دیجیے) مَیں نزدیک ہی ہوں۔'' بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب ایک علیحدہ سی بات ہے' صیام کے احکام کے ضمن میں کیسے آگئی! لیکن غور کیجیے تو صاف سمجھ میں آجائے گا کہ جب صیام و قیام کے نتیجہ میں ایک بندۂ مؤمن کی روح کو جلا ملی اور جب اس کے قلب میں شکر کا جذبہ

اُبھرا تو اس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق مع اللہ کے جوش و ولولہ میں شدّت پیدا ہو۔ طبیعت میں اللہ سے مانگنے' اس سے سوال کرنے' اس کے آگے ہاتھ پھیلانے' اس کے سامنے گڑگڑانے' اس سے استغفار کرنے' اس سے عفو و مغفرت طلب کرنے' اس کی طرف رجوع کرنے اور اپنی خطائوں ' معصیتوں اور لغزشوں سے توبہ کرنے کے جذبات موجزن ہوں۔ گویا اب بندہ اللہ کی طرف ہمہ تن اور پوری یک سوئی سے متوجّہ ہوا۔ اب فطری طور پر دل میں

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میرا ربّ مجھ سے کتنا دُور ہے! لہٰذا نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جاتا ہے کہ اے نبی! جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں تو میری طرف سے ان سے کہہ دیجیے: {فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ} ''پس میں نزدیک ہی ہوں''۔ یہ ہے ایک بندۂ مؤمن کے ہمہ تن متوجّہ ہونے کا نتیجہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی مکرم ﷺ کی زبانی کہ جن کو مشرکین و کُفّارِ مکہ تک الصّادق اور الامین جانتے اور مانتے تھے' اہلِ ایمان کو اپنی قربت کی یقین دہانی کرا رہا ہے۔

ہماری سب سے بڑی کمزوری اور بیماری ہماری غفلت ہے۔ ہماری توجّہ اللہ کی طرف نہیں بلکہ دنیا اور اپنے نفس کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجّہ ہو جانا ہی درحقیقت ہماری ہدایت کا اصل راز ہے۔ جب روح کو کلامِ ربانی سے از سرِ نو تقویت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے ربّ کی طرف متوجّہ ہوجاتی ہے تو اسے بہت قریب پاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ} ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو ان کو بتا دیجیے کہ میں قریب ہوں (کہیں دور نہیں ہوں)!''

اللہ تعالیٰ بندوں سے کتنا قریب ہے' اس کے ضمن میں سورۂ قٓ (جو مکی سورۃ ہے) کی آیت ۱۶ کے یہ الفاظِ مبارکہ {وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾} ''اور ہم اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں۔'' اور اللہ کی معیت کے لیے سورۃ الحدید (جو مدنی ہے) کی آیت ۴ کے یہ الفاظِ مبارکہ {وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ} ''اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے!'' پیش نظر رہیں! اپنے ربّ کو ڈھونڈنے کے

لیے' اس سے مناجات کرنے کے لیے' اس سے راز و نیاز کرنے کے لیے' اس سے عرض و معروض کرنے کے لیے' اس سے طلب کرنے کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے' وہ بالکل قریب ہے۔

اگلی بات فرمائی: {اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ} ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) مجھے پکارے۔'' یہ تو تم ہو کہ ہماری طرف رُخ نہیں کرتے اور متوجّہ نہیں ہوتے۔ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں!

ہر شب کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سمائے دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور پھر ایک صدا ہوتی ہے' ندا لگتی ہے: ھَلْ مِنْ سَائِلٍ فَیُعْطٰی؟ ھَلْ مِنْ دَاعٍ فَیُسْتَجَابُ لَہٗ؟ ھَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَیُغْفَرُ لَہٗ؟ (رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ) ''ہے کوئی مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی پکارنے والا کہ اس کی دُعا قبول کی جائے؟ ہے کوئی گناہوں سے مغفرت چاہنے والا کہ اس کی مغفرت کی جائے؟'' تو ہم اللہ سے غائب ہیں

‘وہ تو غائب نہیں۔
ایک عربی نظم کے چند اشعار کس قدر پیارے ہیں !

اَغِیبُ وَذُو اللَّطَائِفِ لَایَغِیبُ
وَاَرْجُوْہُ رَجَاءً لَا یَخِیبُ
کَرِیمٌ مُنْعِمٌ بَرٌّ لَطِیفٌ
جَمِیلُ السِّتْرِ لِلدَّاعِیْ مُجِیبُ
فَیَا مَلِکَ الْمُلُوکِ اَقِلْ عِثَارِیْ
فَاِنِّیْ عَنْکَ اَنَّاتِنِی الذُّنُوبُ

’’میں غائب ہو جاتا ہوں‘ وہ صاحبِ الطاف و کرم تو غائب نہیں ہوتا۔ میں نے اس سے ایسی آس لگا رکھی ہے جو یاس میں نہیں بدلتی۔ وہ کریم ہے‘ عطا کرنے والا ہے‘ نہایت مہربان ہے‘ لطیف ہے۔ بڑی خوبصورتی سے پردہ پوشی کرنے والا ہے‘

پکارنے والے کی دعا قبول کرنے والا ہے۔ پس اے بادشاہوں کے بادشاہ! میری لغزشوں سے درگزر فرما‘ مجھے تو میرے گناہوں نے تجھ سے دور کر دیا !‘‘

اللہ سے دوری کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اس کی طرف متوجّہ نہیں ہیں۔ وہ تو ہر جگہ‘ ہر آن موجود ہے۔ ہماری تو جہات کسی اور طرف ہیں۔ آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں:{اِنِّیْ وَجَّہْتُ وَجْہِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۷۹﴾ }(الانعام) ’’میں نے متوجّہ کر لیا ہے اپنے چہرے کو اُسی (اللہ) کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین‘ سب سے یک سو ہو کر اور میں نہیں ہوں مشرکوں میں سے۔‘‘یہ دوسری بات ہے کہ یہ الفاظ کہہ دینے کے باوجود اللہ کی طرف توجّہ نہیں ہوتی۔ توجّہ اپنے حساب کتاب میں رہتی ہے‘ دماغ اپنے دُنیوی معاملات ہی کی چکی پیستا رہتا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کی طرف دوبارہ توجّہ فرمائیے: {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ}۔اب رمضان و قرآن اور صیام و قیام کا جو مشترک نتیجہ نکلے گا‘ وہ یہ ہے کہ تمہاری روح بیدار ہو گی‘ تقویت پائے گی اور اللہ کی طرف متوجّہ ہو گی۔ تو اس کے لیے خوشخبری ہے کہ مَیں کہیں دور نہیں ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کے لیے کہیں بیابانوں میں جانے کی اور پہاڑوں کی غاروں میں تپسیائیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔مَیں تمہارے بالکل قریب ہی ہوں۔ گویا ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی !

تمام قدیم مذاہب میں اللہ کے ساتھ بندوں کے ربط و تعلق کا مسئلہ ہمیشہ ایک لاینحل گتھی بنا رہا ہے۔ اکثر مذاہب نے تو اللہ کو اتنا دُور اور بندوں سے اتنا بعید فرض کر لیا ہے کہ اس تک براہِ راست رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ ایسے تمام مذاہب نے اللہ کے دربار تک رسائی کے لیے بے شمار واسطے اور وسیلے گھڑ لیے ہیں اور ناقابلِ فہم مشرکانہ نظام بنا لیے ہیں۔ قرآن نے اس وہم کو دُور کر کے صاف صاف بتا دیا ہے کہ تم جسے دُور سمجھ رہے ہو'

وہ دُور نہیں ہے' تمہارے بالکل قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لیے کہیںجانے کی ضرورت نہیں ہے' جب چاہو اور جہاں چاہو اُس سے ہم کلام ہوجائو۔ اقبال نے اپنی ایک نظم میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے حوالے سے نقشہ کھینچا ہے کہ یہ جو میرے دربان بن کر بیٹھ گئے ہیں کہ ان کو خوش کیے بغیر مجھ تک رسائی نہیں ہو سکتی' یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ان کو ہٹا دو' میرا دربار ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ یہاں کسی کے لیے کوئی قدغن نہیں۔ خلوص کے ساتھ جب اور جہاں چاہو' مجھے پکارو اور مجھ سے جو چاہو' مانگو۔ علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو !

یہ نہیں ہے کہ تمہاری دُعا کسی پوپ' کسی پادری' کسی پروہت' کسی پجاری' کسی پنڈت یا کسی پیر ہی کی وساطت سے مجھ تک پہنچ سکتی ہے ! (عجب اتفاق ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان حائل ہونے والے سب مہاپُرشوں کے نام ''پ'' ہی سے شروع ہوتے ہیں۔) ان سب خود ساختہ واسطوں اور وسیلوں کو درمیان میںسے ہٹادو۔ اللہ کا ربط و تعلق بندے کے ساتھ براہِ راست ہے۔ یہاں کسی واسطے کی ضرورت ہے ہی نہیں ! اس تعلق کے مابین حجاب ہم خود ہیں۔ ہماری حرام خوری ہے جو حجاب بنی ہوئی ہے۔ ہماری غفلتیں ہیں جو حجاب بنی ہوئی ہیں۔ اپنی غفلتوں کا پردہ چاک کیجیے اور آج اللہ کی جناب میں توبہ کیجیے ! وہ ہر آن' ہر لحظہ تمہاری دُعا کو سننے والا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی قریب رہتا ہے اور رمضان میں تو اس عموم میں خصوص پیدا ہوجاتا ہے۔ آیت مبارکہ کے اس حصّہ میں ہمارے لیے بشارت' تسلی' تسکین اور راحت کا سامان رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں انسان کے لیے آزادی کا پیغام ہے ! دنیا میں انسانی حقوق کے منشور (Magna Carta) کی بہت دھوم ہے' جبکہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا ''میگنا کارٹا'' اور

کوئی نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق ' اس سے فریاد' اس سے استغاثہ' اس سے حاجت روائی کی درخواست میںکوئی ''پ'' سے شروع ہونے والا' جن کی فہرست مَیں گنوا چکا ہوں' حائل نہیں ہے۔

مَیں صوفیاء کرام کے سلسلۂ ارشاد کی نفی نہیں کر رہا۔ کوئی خدا ترس مرشد ہو' جو قرآن و سُنّت کی روشنی میں تزکیۂ نفس کرنے اور صحیح طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلانے والا ہو تو{ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿ ۱۱۹ ﴾ } (التوبۃ) کی قرآنی ہدایت کے مطابق ایسے مرشدین سے ضرور فیض حاصل کرنا چاہیے۔ ہمارے یہاں پیری مریدی کا جو عام اور غلط تصوّر رائج ہے' اس کے اعتبار سے مَیں اس کی نفی کر رہا ہوں۔

یہاں نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ہمیں خوش خبری دی جارہی ہے: {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ} دُعا کے لیے وضو کی بھی شرط نہیں ' آپ حالت ِناپاکی میں بھی دُعا مانگ سکتے ہیں۔ دُعا پر کوئی قدغن نہیں ہے' آپ ہر حال میں اپنے ربّ کے حضور دست ِسوال دراز کر سکتے ہیں۔

البتہ ایک بات ملحوظ رہے' آیت کے اس حصّہ میں پکارنے والے کی ہر پکار سننے اور جواب دینے کا ذکر ہے۔ یہاں یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ ہر دُعا کے قبول کرنے کا حتمی وعدہ بھی ہے۔ بے چارے بندے کو کیا خبر کہ وہ جو دُنیوی چیز اللہ سے مانگ رہا ہے' اس میں اس کے لیے خیر ہے یا شر! کون سی شے اُس کے حق میں مفید ہو گی اور کون سی مُضر! دُعائیں وہی قبول ہوں گی جو اللہ کی رحمت و حکمت ِ مطلقہ کے منافی نہیں ہوں گی۔ البتہ نبی ٔ رحمت ﷺ نے یہ خوش خبری دی ہے کہ بندہ ٔ مؤمن کی کوئی دُعا نہ ردّ ہوتی ہے' نہ ضائع۔ وہ جس چیز کے لیے دُعا کرتا ہے 'اگر وہ اللہ تعالیٰ کے علم کاملہ میں بندے کے حق میں مفید ہوتی ہے تو اُسے وہی عطا کر دی جاتی ہے' یا پھر اس سے بہتر چیز عنایت ہو جاتی ہے' یا پھر اللہ ربّ الکریم اس دُعا کو بندے کے حق میں نیکی قرار دے کر اس کے اجر و ثواب کو آخرت کے لیے محفوظ فرما لیتا ہے۔ ایسی دُعا کے عوض اس کے نامۂ اعمال میں سے بہت سی بُرائیوں کے داغ دھو دیے جاتے ہیں۔ الغرض بندۂ مؤمن کی کوئی دُعا ضائع نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں قبول ہوجاتی ہے۔

اس آیت مبارکہ کے اگلے حصّہ میں دو شرطوں کا بیان آرہا ہے۔ پہلی یہ کہ: { فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ} اور دوسری یہ کہ:{وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ}۔ ان دونوں کو سمجھنا ہو گا۔ پہلی

شرط میں فرمایا کہ میرے بندوں کو بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں' میری پکار پر لبیک کہیں۔ میں جب پکاروں 'فوراً حاضر ہوجائیں۔ جس چیز کا حکم دوں' بجا لائیں۔ جس کام سے اور جس چیز سے روک دوں ' رک جائیں۔{ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ}''پس انہیں بھی چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں۔''یک طرفہ معاملہ (Oneway Traffic) نہیں چلے گا۔ قرآن مجید میں یہ بات متعدد جگہ ملے گی کہ اللہ تعالیٰ یک طرفہ معاملہ نہیں فرماتا۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں فرمایا: {اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ

بِعَهْدِكُمْ} ''تم اُس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے' مَیں اُس عہد کو پورا کروں گا جو مَیں نے تم سے کیا ہے۔'' جیسے سورۂ ابراہیم میں فرمایا:{لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿ ۷ ﴾} ''اگر تم شکر گزاری کرو گے تو بالیقین مَیں تمہیں اور زیادہ نعمتیں دوں گا' اور اگر تم نے ناشکری کی تو پھر میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔'' اور سورۂ محمد (علي صاحبها الصلوة والسلام) میں فرمایا:{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ }(آیت ۷) ''اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔'' تم اللہ (کے دین) کی مدد نہ کرو بلکہ اُس کے دشمنوں سے ساز باز کرو' اُس کے باغیوں سے یارانہ گانٹھو اور چاہو کہ اللہ تمہاری مدد کرے تو یہ نہیں ہوگا! اُس کا ارشاد ہے کہ اگر تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا{فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ}(البقرۃ:۱۵۲)۔

ایک حدیثِ قدسی میں تو بڑے پیارے الفاظ آتے ہیں کہ ''میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان رکھتا ہے' میں اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے بہتر محفل میں (ملأ اعلیٰ' ملائکہ مقربین کی محفل میں) یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت بھر میرے قریب آتا ہے تو مَیں ہاتھ بھر اُس کے قریب ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو مَیں دو ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ چل کر میری طرف آتا ہے تو مَیں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔'' (رواہ البخاری و مسلم) تو دو طرفہ معاملہ ہوگا۔ اسی طرح اگر تم

چاہتے ہو کہ میں تمہاری دُعائیں قبول کروں تو تم بھی میری پکار پر لبیک کہو۔ {وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ} ''اور انہیں چاہیے کہ مجھ پر ایمان پختہ رکھیں۔'' اس آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: {لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿ ۱۸۶ ﴾} ''تاکہ ان پر فوزو فلاح اور رشد وہدایت کی راہیں کھل جائیں (اور یہ ان راہوں پر گامزن ہوجائیں)۔''

روزے کے احکام

اگلی آیت (نمبر ۱۸۷) میں روزے سے متعلق احکام ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ابتدائی حکم آیا تھا کہ ''تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا۔'' شریعت موسوی میں سحری کا کوئی نظام نہیں تھا۔ رات کو سوجاؤ تو روزہ شروع اور روزے کے دن کے علاوہ شب میں بھی تعلقِ زن وشو کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دو شرطیں بڑی کڑی تھیں۔ صحابہ کرامث کو یہ مغالطہ تھا کہ شاید یہ پابندی ہمارے یہاں بھی ہے۔ تاہم چونکہ کوئی واضح حکم بھی نہیں تھا لہٰذا کوئی نہ کوئی رات کو بیوی کے ساتھ ہم بستری کر بیٹھتا تھا' لیکن دلوں میں یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ہم نے غلط کام کیا ہے' گناہ کا ارتکاب کرلیا ہے۔ اس پس منظر میں احکام دے دیے گئے کہ اس اعتبار سے تمہارا روزہ یہود کے روزے سے مختلف ہے۔ فرمایا: {اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ط} ''حلال کیا گیا

تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا۔ ''{ہُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّہُنَّ ؕ}'' وہ تمہارے لیے بمنزلۂ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلۂ لباس ہو۔'' جیسے انسان کے لباس اور اس کے جسم کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی ایسے ہی میاں بیوی کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ یہ بڑے لطیف انداز میں تعلق زن و شو کی تعبیر ہے۔

آگے ارشاد فرمایا: {عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ} ''اللہ خوب جانتا ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔'' یہ بڑا بلیغ پیرایہ ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص بکری کا گوشت کھا رہا ہے' لیکن اسے شک ہے کہ شاید یہ خنزیر کا ہے' تو وہ گناہ گار ہو گیا' کیونکہ جیسے ہی اسے شک ہوا تھا کہ یہ خنزیر کا گوشت ہے' اسے رک جانا چاہیے تھا۔

اگر وہ اس شبہ کے باوجود کھا رہا ہے تو اپنے آپ سے خیانت کر رہا ہے۔ مفہوم یہ ہوا کہ اگرچہ فی نفسہٖ روزے کی شب میں تعلقِ زن و شو جائز تھا' لیکن جس کا یہ خیال تھا کہ یہ ناجائز ہے' پھر بھی کر بیٹھا' وہ تو گناہ گار ہو گیا۔ اب تسلی دی جا رہی ہے کہ {فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ وَ عَفَا عَنۡکُمۡ ۚ} ''پس اُس نے تم پر نظر عنایت کی اور تمہاری خطا کو معاف کر دیا۔'' اس حصّہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا بیان ہے۔ آگے قانون واضح فرما دیا کہ یہ حرام اور ناجائز ہے ہی نہیں۔ تم خوا مخواہ کے شک اور وہم میں مبتلا رہے۔ {فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡہُنَّ وَ ابۡتَغُوۡا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ ۪} '' اب تم (روزے کی راتوں کو بلا روک ٹوک) مباشرت کر سکتے ہو اور (خواہش کرو' حاصل کرو) تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔'' اس سے مراد اولاد بھی ہے جو اللہ تعالیٰ اس تعلقِ زن و شو کے نتیجہ میں عطا فرماتا ہے اور تسکین بھی {لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا}۔ یہ بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے جو اللہ نے انسان کے لیے رکھی ہے۔

دوسری رعایت یہ ہے کہ {وَ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا} ''کھاؤ اور پیو۔'' رات کے وقت کھانے پینے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ البتہ ایک حد مقرر ہے کہ {حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ } ''یہاں تک کہ رات کی سیاہ دھاری سے صبح کی سفید دھاری تمہیں صاف دکھائی دینے لگے (ممیز ہو جائے)۔'' یہ وہ وقت ہے جسے ہم پو پھٹنا کہتے ہیں' جب ایک لکیر سی مشرق میں نظر آتی ہے۔ یہ گویا طلوعِ فجر ہے۔ اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔ یہ سحری ہے' جس کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ تاکید ہے۔ حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے :((تَسَحَّرُوۡا فَاِنَّ فِی السَّحُوۡرِ بَرَکَۃً)) (متفق علیہ) ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحری میں بڑی برکت ہے۔'' آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین درحقیقت یہ سحری ہی مابہ الامتیاز شے ہے۔ پھر اس میں بڑی وسعت رکھی گئی ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان سحری کھا رہا ہے۔ ایک نوالہ اس کے مُنہ میں ہے اور ایک ہاتھ میں ہے اور شک ہو گیا ہے کہ شاید پو پھٹ گئی ہے' تب بھی وہ اس برکت کو پورا کر لے۔ اس میں تشدد اور سختی سے منع کیا گیا ہے۔ گویا اس

طور پر نبی اکرم ﷺ {یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ} کی تبیین اور تشریح فرما رہے ہیں۔

آگے فرمایا: {ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ} ''پھر روزے کو پورا کرو رات تک۔'' اہل سُنّت کے تمام فقہی مکاتب کے نزدیک غروبِ آفتاب کے معاً بعد رات شروع ہوجاتی ہے۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کی سُنّت سے ثابت ہے۔ اس بارے میں احادیث ِ شریفہ میں ہمیں حضور ﷺ کی یہ تاکید ملتی ہے کہ افطار میں جلدی کیا کرو' اسی میں برکت ہے۔ اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔ اہلِ تشیّع کے یہاں معاملہ مختلف ہے' لیکن ہمارے لیے صحیح عمل یہی ہے کہ سُنّت کے مطابق غروبِ آفتاب کے فوراً بعد افطار کرلیا جائے۔

اس آیت کے آخری حصّے میں حکم آیا کہ :{وَ لَا تُبَاشِرُوۡہُنَّ وَ اَنۡتُمۡ عٰکِفُوۡنَ ۙ فِی الۡمَسٰجِدِ} '' اور ان سے مباشرت مت کرو اگر تم مسجدوں میں اعتکاف کی حالت میں ہو۔'' یعنی دورانِ اعتکاف رات کو بھی تعلقِ زَن و شو کی اجازت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف ماہ رمضان المبارک کی ایک خصوصی عبادت ہے۔ حضور اکرم ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی سُنّت اور بڑی عظیم نفلی عبادت ہے۔ اس کے تفصیلی احکام بھی سُنّت ہی سے ملتے ہیں۔ یہاں حالت ِ اعتکاف میں مباشرت کی قطعی ممانعت وارد ہوگئی۔ البتہ بیوی مسجد میں آسکتی ہے' گفتگو کر سکتی ہے' مشورہ لے سکتی ہے۔

آگے فرمایا: {تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ فَلَا تَقۡرَبُوۡہَا} ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' پس ان کے قریب بھی مت جانا۔'' تجاوز کرنا تو دُور کی بات ہے' وہ کھلی معصیت ہے' فرمایا جا رہا ہے کہ حدود اللہ کے قریب بھی نہ پھٹکنا' ذرا فاصلے پر ہی رہنا۔ اس بات کو نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت بلیغ اسلوب سے سمجھایا اور واضح فرمایا ہے کہ: ''ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے۔ اللہ نے جو چیزیں حرام کر دی ہیں وہ اس کی محفوظ چراگاہ کے مانند ہیں۔ کوئی چرواہا اپنے گلے کو اگر آخری حد تک لے جائے گا تو کبھی کوئی بھیڑ بکری چھلانگ لگائے گی اور اس ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہوجائے گی۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ کچھ فاصلے پر رہو۔''

اس آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوتا ہے: {کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾} ''اس طرح اللہ اپنی آیات کی لوگوں کے لیے وضاحت فرماتا ہے (اپنے احکام کھول کھول کربیان کرتا ہے) تاکہ وہ اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچیں (تقویٰ اختیار کریں)۔'' یہاں اس رکوع کی پانچویں آیت ختم ہوتی ہے ۔پہلی آیت ختم ہوئی تھی ان الفاظ پر{لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ} جبکہ یہ آیت ختم ہوتی ہے {لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ} پر۔ اس سے بھی رمضان کے پورے پروگرام کا تقویٰ سے جو گہرا تعلق ہے' اس کو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اکلِ حلال اور تقویٰ کا باہمی تعلق

اس رکوع کی آخری آیت کا بظاہر رمضان کے روزوں سے تعلق معلوم نہیں ہوتا' لیکن حقیقت میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لیے کہ دو مقامات پر بڑے شدو مد سے روزوں کی غایت تقویٰ بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کے متعلق سوچنا پڑے گا کہ اس تقویٰ کا ''معیار'' کیا ہے اور اس کا عملی ظہور کس طور سے ہوگا ! کیا تقویٰ کا تعلق کسی خاص قسم کی وضع قطع سے ہے؟ کیا تقویٰ کسی خاص شکل و صورت کا نام ہے کہ ''شرعی مقدار'' کے مطابق داڑھی رکھ لی ہے اور ازار ٹخنوں سے اونچا پہننے کا اہتمام ہے؟کیا اس طرح تقویٰ کے تقاضے پورے ہوگئے؟ معاذ اللہ ! ان چیزوں کی نفی نہیں ہے۔ جو چیز بھی سُنّت کے مطابق ہے' وہ اپنی جگہ نورانی ہے اور یقیناً ہمارے لیے قابلِ قدر ہے۔ میں نے یہ اندازِ گفتگو آپ لوگوں کو چونکانے کے لیے اختیار کیا ہے' کیونکہ اصل تقویٰ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اصل تقویٰ ہے اکلِ حلال !

اکلِ حلال ہے تو تقویٰ ہے' یہ نہیں ہے تو تقویٰ نہیں ہے۔چاہے شکل و صورت اور وضع قطع کتنی ہی ان چیزوں کے مطابق بنا لی گئی ہو جن کو عام طور پر ''تقویٰ'' سمجھا جاتا ہے' وہ اصل تقویٰ نہیں ہے۔ عبادتوں کے کتنے ہی ڈھیر لگا لیے گئے ہوں اور ہر سال عمرے پر عمرے اور حج پر حج کیے جارہے ہوں تو یہ بھی اصل تقویٰ نہیں ہے۔ یہ اہم بات سمجھنے کی ہے۔ روزے میں حلال چیزیں کیوں نہیں کھاتے ! تعلقِ زَن و شو قائم کیوں نہیں کرتے ! اس لیے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ لیکن روزے کی حالت میں آپ دوسرے نواہیٔ شریعت کا

ارتکاب کر رہے ہیں تو آپ نے درحقیقت روزہ رکھا ہی نہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ یہ فتویٰ ہے حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَ شَرَابَہٗ))(رواہ البخاری وابوداؤد والترمذی' عن ابی ھریرہؓ)

''جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

محض بھوکا پیاسا رہنے سے کیا حاصل؟ یہ روزہ تو نہ ہوا کہ روزہ رکھا ہوا ہے اور کاروبار میں' عام بات چیت میں دھڑلے سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے اور جوا کھیل رہے ہیں۔ تاش' شطرنج' کیرم یا اسی نوع کی خرافات کا شغل ہو رہا ہے۔ کوئی ٹوکے تو جواب ملتا ہے کہ ''روزے کو بہلایا جارہا ہے''۔ ''غیبت'' ازروئے قرآن مجید اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے ! روزہ رکھ کر حلال جانور کا حلال گوشت تو کھا نہیں رہے اور بے محابہ غیبتیں کر کر کے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ روزہ کہاں ہوا ! یہ فاقہ ہے' روزہ نہیں ! یہ میرا یا کسی مولوی کا نہیں بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فتویٰ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا

ارشاد نقل کرتے ہیں: ((رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صِیَامِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ...)) (رواہ ابن ماجہ) ''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔'' اگر فی الواقع روزہ رکھا ہو اور اس کے نتیجے میں تقویٰ پیدا ہو تو اس کا معیار اور اس کی کسوٹی ہے اکلِ حلال!

چنانچہ اس رکوع کی آخری آیت میں فرمایا: {وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ} ''اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے مت کھاؤ!'' یعنی حرام طریقوں سے ایک دوسرے کے مال ہڑپ نہ کرو۔ {وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ} ''اور اپنے اموال کو (رشوت کے طور پر اور ناجائز طریقوں سے دے دلا کر) حکام تک پہنچنے کا ذریعہ مت بناؤ'' {لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾٪}

''کہ اس طرح لوگوں کے مال کا کچھ حصّہ جانتے بوجھتے ناحق اور گناہ سے ہضم کر جاؤ۔'' یعنی ایسا نہ کرنا کہ حکام کو رشوت دی اور کسی کا حق اپنے نام کرالیا۔ قاضی کو کوئی رشوت دی اور کسی کی زمین کی ڈگری اپنے نام کرا لی۔ سرکاری اہل کاروں کو رشوت دی اور کسی کا مال کھا گئے۔ یہ رشوت حرام کی ایک بڑی نمایاں شکل ہے۔

اس آخری آیت کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّہ میں تو حرام کاروبار سے اور دیگر حرام طریقوں سے آمدنی کی کلی ممانعت ہو گئی۔ جیسے سودی لین دین' سٹہ اور اسی قبیل کے تمام ناجائز ذرائع سے کمائی کی نفی ہو گئی۔ دوسرے حصّہ میں حکام تک رسائی کے لیے رشوت کو ذریعہ بنانے اور لوگوں کے مال ناحق اور ناجائز طریقوں سے ہڑپ کرنے سے باز رہنے کی خاص طور پر تاکید ہو گئی۔ روزے اور رمضان کے احکام کے ساتھ اس آیت کو رکھ کر گویا یہ رہنمائی دے دی گئی کہ جان لو کہ اصل تقویٰ یہ ہے۔ اگر حرام خوری سے باز نہ آئو تو پھر چاہے تم عبادات کے ڈھیر پر ڈھیر لگا لو' وہ تقویٰ حقیقی نہیں ہوگا بلکہ اس کا بہروپ ہو گا۔ وہ تمہاری کچھ رسومات ہیں جن کا تم نے طومار باندھ رکھا ہے۔ وہ حقیقی عبادات سرے سے ہیں ہی نہیں!

اس آیت مبارکہ اور ان احادیث سے جو ابھی پڑھی گئی ہیں' یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تقویٰ کا حقیقی معیار اکلِ حلال ہے۔ اس کی اہمیت کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث کا مطالعہ کر لیجیے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور اسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حدیث مبارک کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا)) ''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیزیں ہی قبول کرتا ہے۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قرآن حکیم کی دو آیات تلاوت فرمائیں جن میں رسولوں اور مؤمنوں کو اکلِ حلال کا حکم دیا گیا ہے۔ ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ''پھر حضور ﷺ نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر طے کر کے آتا ہے' اس کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں۔'' فرض کیجیے کہ کوئی شخص آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے دُور دراز سے حج کے لیے نکلا

ہو اور بہت طویل سفر کر کے عرفات تک پہنچا ہو۔ آج کل تو آپ ہوائی جہاز سے تین چار گھنٹے میں جدہ اور آگے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکہ مکرمہ پہنچ جاتے ہیں۔ پھر حج کے مناسک کی ادائیگی کے لیے جو سہولتیں اِس دَور میں مہیّا ہیں' ان سے متمتع ہو کر اگر واپسی کی جلدی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں حج کے تمام مناسک سے فارغ ہو کر آرام سے اپنے شہر واپس پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ذرا اُس دَور کا تصوّر کیجیے کہ کوئی شخص فَجٍّ عَمِیْق (دور دراز کی راہوں) سے آیا ہے۔ اسے تو مہینوں کی مسافرت طے کرنی پڑی ہے۔ اس کا جو حلیہ بنا ہو گا اسے چشم تصوّر میں لائیے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:((یَمُدَّ یَدَہٗ اِلَی السَّمَاءِ یَا رَبِّ یا رَبِّ)) ''یہ شخص آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھا کر پکار رہا ہے: اے میرے پروردگار! اے میرے مالک و آقا!''((وَمَطْعَمُہٗ حَرَامٌ وَّمَشْرَبُہٗ حَرَامٌ وَّمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ وَّغُذِّیَ بِالْحَرَامِ)) ''حالانکہ اس کا کھانا بھی حرام کا' پینا بھی حرام کا' لباس بھی حرام کا اور اس کا جسم حرام کی غذا سے پلا بڑھا ہے۔'' اس شخص کے بارے میں حضور ﷺ فرماتے ہیں:((فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ؟)) ''تو ایسے شخص کی دُعا کیونکر قبول کی جائے؟'' یہ حرام خوری اس کے اور اس کے ربّ کے درمیان حجاب بن گئی ہے۔ اس کی دُعا قبول ہو تو کیسے ہو؟

ایک وضاحت پیشِ نظر رہے کہ یہاں جس حرام کا ذکر ہے اُس سے کھانے پینے کی وہ چیزیں مراد نہیں ہیں جو نصوصِ قطعی سے حرام ہیں' بلکہ وہ حرام خوریاں ہیں جن کا آج کل عام رواج ہے اور جن کے حرام ہونے کا خیال اِلَّا مَاشَاءَ اللہ ہی لوگوں کو رہ گیا ہے۔ اس رکوع کی یہ آخری آیت اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس نے ہمارے سامنے حقیقی تقویٰ کا ایک معیار رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان تمام نواہی اور منکرات سے بچ سکیں جن سے ہمارا دین ہمیں بچانا چاہتا ہے' اور صحیح تقویٰ اختیار کرنے کے لیے ہمارے دلوں میں طلبِ صادق پیدا فرمائے اور اس پر پوری زندگی مستقیم رہنے کے لیے ہماری نصرت فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم و لسائر المسلمین والمسلمات

روزہ' رمضان اور قرآن

جامع القرآن‘قرآن اکیڈمی لاہور میں

’’استقبالِ رمضان المبارک‘‘پر خطابِ جمعہ (بتاریخ:۲۴شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ /۲۰۰۴ء)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولِہ الکریم ... امَّا بَعد:اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَہُوَ خَیْرٌ لَّہٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْہُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَہِدَ مِنْکُمُ الشَّہْرَ فَلْیَصُمْہُ ؕ وَ مَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۫ وَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمْ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّہُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ } (البقرۃ)

رمضان المبارک کی آمد کے موقع پر مجھے روزہ کی حکمت‘ اس کے احکام‘ اس کے لیے ماہِ رمضان المبارک کے انتخاب کی حکمت‘ اور پھر روزے اوررمضان کے پروگرام سے اصلاً جو کچھ حاصل ہونا چاہیے‘ اس کے بارے میںکچھ باتیں آپ کے سامنے رکھنی ہیں۔

عربوں کے ہاں صوم کا قدیم تصوّر

پہلے تاریخی اعتبار سے یہ بات سمجھ لیجیے کہ اسلام کی جو عبادات ہیں ان میں سے بعض عبادات کسی نہ کسی صورت میں اہلِ عرب کے ہاں پہلے سے موجود تھیں۔ مثلاً لفظ ''صلوٰۃ'' ان کے ہاں پہلے بھی موجود تھا۔ وہ بھی نماز پڑھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے تھے ‘لیکن ''صلوٰۃ'' کے نام سے بہرحال ایک عبادت ان کے ہاں رائج تھی‘ جسے حضور ﷺ کے زمانے میں آکر یہ شکل دی گئی جس طرح آج ہم نماز ادا کر رہے ہیں۔ حج کا معاملہ تو اکثر و بیشتر صحیح طرز پر ہو رہا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنے طور پر یہ طے کر رکھا تھا کہ ہم چونکہ کعبے کے متولی ہیں‘ لہٰذا ہم حرم کی حدود سے باہر نہیں جاسکتے۔ تو وہ باہر سے آنے والے لوگوں کے برعکس عرفات میں نہیں جاتے تھے‘ بلکہ منیٰ ہی میں مقیم رہتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی اسلام نے اصلاح کر دی۔ باقی وہ قربانیاں بھی دیتے تھے اور طواف بھی کرتے تھے۔ تاہم تلبیہ وغیرہ میں انہوں نے مشرکانہ الفاظ اختیار کر رکھے تھے۔ زکوٰۃ‘ صدقات اور خیرات کا تصوّر بھی ان کے ہاں موجود تھا‘ بلکہ اس ضمن میں وہ ایک دوسرے سے مسابقت بھی کرتے تھے کہ اُس نے اتنے غریبوں کو کھانا کھلایا تو مَیں اس سے زیادہ کو کھلاؤں گا۔

البتہ جہاں تک روزے کا تعلق ہے وہ اس طرح کی کسی عبادت سے سرے سے واقف ہی نہیں تھے۔ چنانچہ ہمیں پورے مکی قرآن میں لفظ ''صوم'' نہیں ملتا۔ تاہم اہلِ عرب کے ہاں صوم کا ایک تصوّر موجود تھا‘ جہاں سے قرآن نے یہ لفظ اخذ کر کے اسے اس عبادت کے لیے عنوان بنایا ہے۔ ان کے ہاں صوم کا تصوّر یہ تھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کو بھوک‘ پیاس اور گرمی کی شدت برداشت کرنے کی مشق کراتے تھے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ان کے ہاں لڑائی‘ غارت گری اور خانہ جنگی زندگی کے معمول کی حیثیت رکھتی تھی اور اس طرح کی مہم جوئی میں انہیں تیز رفتار سواری کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کی عام سواری اونٹ تھا‘ جو اُن کے ماحول کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا کہ اسے خواہ ہفتوں پینے کو پانی نہ ملے‘ کھانے کو کچھ نہ ملے تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بادِ سموم کی اسے کوئی پروا نہیں۔

لیکن تیز دوڑنے کے لیے انہیں گھوڑا چاہیے تھا جو ایک نازک جانور ہے اور اس کے اندر تمکنت اور نزاکت ہے۔ لہٰذا اسے ان سختیوں کا خوگر بنانے کے لیے وہ اسے بھوکا پیاسا رہنے کی مشق کراتے تھے۔ مزید یہ کہ جب بادِ سموم چلتی تھی تو عرب بدو اپنا چہرہ تو کپڑے کے اندر لپیٹ لیتے تھے‘ لیکن گھوڑے کا منہ سیدھا اُس طرف رکھتے تھے جدھر سے لو آرہی ہوتی‘ تاکہ اس میں اس جھلسا دینے والی ہوا کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے۔ اس عمل کو وہ صوم کا نام دیتے تھے‘ البتہ انسانوں کا روزہ رکھنا ان کے ہاں رائج نہیں تھا۔

روزے کے ابتدائی احکام

رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہاں آپؐ نے دیکھا کہ یہودی یومِ عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو انہوں نے بتایا کہ اس روز ہمارے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو آلِ فرعون سے نجات ملی تھی۔ فرعون اور اس کا لشکر غرق کیا گیا اور ہمیں آزاد کر دیا گیا' تو ہم اس دن کے شکرانے کے طور پر روزہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ موسیٰ ؑ کے حق دار ہیں۔ پھر آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ بھی یومِ عاشورہ کا روزہ رکھیں اور اس کے ساتھ ایک روزے کا اضافہ کریں تاکہ ان کا یہودیوں سے علیحدہ تشخص بھی قائم ہو جائے۔ مسلمانوں میں روزے کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔

اس کے بعد قرآن مجید میں روزے کا جو پہلا حکم آیا وہ اصل میں ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ہر ماہ تین روزے لازم کر دیے تھے۔ قرآن مجید میں شریعت کے احکام میں تدریج آئی ہے۔ نماز میں تو اس قدر تدریج آئی ہے کہ پہلے رات کا دو تہائی حصّہ' آدھا حصّہ یا ایک تہائی حصّہ کھڑے رہنے کا حکم تھا۔ اس کے بعد نرمی آنی شروع ہوئی۔ باقی سب چیزوں میں شروع میں نرمی تھی' بعد میں رفتہ رفتہ سختی ہوئی۔ شراب کے بارے میں پہلے صرف یہ کہا گیا کہ اس میں اگرچہ لوگوں کے لیے فائدہ بھی ہے' لیکن اس کے اندر گناہ کا پہلو زیادہ ہے۔ پھر اگلا حکم آیا کہ اگر تم شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ بہت سے لوگوں نے اسی پر شراب چھوڑ دی۔

پھر سورۃ المائدۃ میں آخری حکم آگیا جس میں اسے ''رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ'' قرار دے دیا گیا۔

اہلِ عرب چونکہ روزے سے واقف نہیں تھے' اس کے عادی نہیں تھے' لہٰذا اگر ایک مہینے کے روزے فوراً رکھوا دیے جاتے تو یہ معاملہ ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ پہلے عادی بنانے کے لیے ہر ماہ تین دن' چاند کی تیرہویں' چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے روزے لازم کئے گئے۔ قرآن حکیم میں روزے کا پہلا حکم انہی ایامِ بیض کے روزوں کے بارے میں آیا ہے۔ فرمایا:

{یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾}

''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلی اُمتوں پر فرض کیا گیا تھا' تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔''

عام طور پر ''صیام'' کا ترجمہ جمع کے صیغے میں ''روزے'' کر دیا جاتا ہے' جو درست نہیں۔ ''صیام'' دراصل ''صوم'' کی جمع نہیں ہے' بلکہ مصدر ہے [صَامَ یَصُوْمُ صَوْمًا وَصِیَامًا]۔ روزے کی فرضیت کا حکم دینے کے ساتھ ہی یہ فرما دیا گیا کہ یہ تمہارے لیے کوئی نیا حکم نہیں ہے' بلکہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزر چکی ہیں ان پر بھی روزہ

فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہود اور نصاریٰ کے ہاں بھی روزے کی عبادت موجود تھی۔

روزے کا مقصود: حصولِ تقویٰ

آیت مبارکہ کے آخر میں روزے کا مقصد بایں الفاظ بیان فرمایا گیا: { لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ ''تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے''۔ تقویٰ کا معنی ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا۔ اس کا لفظی معنیٰ بچنا ہے۔ یعنی دنیا میں اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچو گے' بُرے کاموں سے بچو گے تو آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ جائو گے' جہنّم سے بچ جائو گے۔ یہ دونوں جگہ کا بچنا ہے۔ اس روش کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن بعض قوتیں ایسی ہیں جو انسان کو اِس روش پر چلنے سے روکتی ہیں۔ ان میں سے مثلاً ایک قوت ہمارا اپنا

نفس ہے۔ ہمارے نفسانی تقاضے اندھے بہرے ہیں۔ بھوک لگی ہے تو جو بھی مل جائے کھانا ہے' خواہ حلال ہے یا حرام! پیاس لگی ہے تو جو بھی مل جائے پینا ہے' چاہے جائز ہے یا ناجائز! شہوت کا جذبہ اُبھرا ہے تو اسے پور اکرنا ہے' حرام یا حلال' جائز یا ناجائز' جس راستے سے بھی ہو۔ چونکہ انسان عام طور پر نفس کا غلام ہوتا ہے لہٰذا اس نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے روزے کی صورت میں ایک ایکسرسائز دی گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ملٹری میں ہر وقت مشقیں (exercises) کرائی جاتی ہے۔ اگرچہ جنگ کی نوبت تو کبھی کبھار آتی ہے 'لیکن مسلح افواج کو اس کے لیے ہمہ وقت تیار رکھا جاتا ہے۔ ان پر ملکی بجٹ کا سب سے بڑا حصّہ خرچ کیا جاتا ہے اور انہیں جنگی مشقوں میں مصروف رکھا جاتا ہے۔

اسی طرح کی یہ ایک مشق ہے جو روزے کی صورت میں اہلِ ایمان سے کرائی جاتی ہے کہ وہ پورا مہینہ صبح سے شام تک حلال چیز بھی نہیں کھائیں گے۔ حالانکہ بھوک لگ رہی ہے' کھانا موجود ہے' لیکن نہیں کھائیں گے' اس لیے کہ اللہ کا حکم نہیں' روزہ رکھا ہوا ہے۔ پیاس لگ رہی ہے' پانی موجود ہے' لیکن نہیں پئیں گے' اس لیے کہ اللہ کی اجازت نہیں' روزہ رکھا ہوا ہے۔ جنسی جذبہ اُبھرا ہے' بیوی موجود ہے یا قانونی جائز لونڈی موجود ہے' آپ اس جذبے کی تسکین کر سکتے ہیں' لیکن نہیں کریں گے' اس کی اجازت نہیں ہے ' اس لیے کہ روزہ رکھا ہوا ہے۔ یہ مشق اگر آپ کریں گے تو آپ میں وہ قوت پیدا ہو جائے گی جس کو عام الفاظ میں ضبطِ نفس کہا جاتا ہے' یعنی آپ اپنے نفس کو کنٹرول میں کر سکیں گے۔ اس نفس کا اور ہمارا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ایک گھوڑے اور اس کے سوار کا ہے۔ اگر گھوڑا زیادہ طاقتور ہے اور سوار کمزور ہے تو گھوڑا اسے کہیں نہ کہیں پٹخ دے گا۔ لیکن اگر سوار طاقتور ہے' اس کی رانوں میں جان ہے اور اُس نے گھوڑے کو اپنی رانوں کے درمیان کسا ہوا ہے تو پھر گھوڑا سوار کے اشارے پر حرکت کرے گا۔ نفس اگر منہ زور ہے تو وہ آپ کو کسی بھی وقت کسی بھی گناہ میں ملوث کر دے گا۔

چنانچہ نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے آپ سے روزے کی یہ مشق کرائی جاتی ہے۔
آگے بڑھنے سے قبل دو الفاظ کا فرق سمجھ لیجیے۔ ایک ہے ضبطِ نفس(self control) اور ایک ہے نفس کُشی (self annihilation)۔نفس کُشی یعنی نفس کو کچل دینا اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق دیا جائے۔ چنانچہ نفس کا جو بھی حق ہے وہ ادا کیا جائے اور اس کی حق تلفی نہ کی جائے۔ اللہ نے تمہارے اندر بھوک کا داعیہ رکھا ہے تو اس بھوک کو جائز طریقے سے پورا کرو۔ اسی طرح جنسی تقاضا جائز ذریعے سے پورا کرو۔ یعنی ضبطِ نفس ہو' نفس کُشی نہیں۔ نفس کُشی رَہبانیت ہے اور رہبانیت کی ابتدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے کی تھی۔ سورۃ الحدید میں الفاظ آئے ہیں: {وَرَهْبَانِيَّةَ نِابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ} ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی' یہ ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی''۔ اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔ نفس کو کچلنا اسلام کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے : ((اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔ لیکن اس کا حق جائز طریقے سے پورا کرو۔ نفس پر تمہارا کنٹرول ہونا چاہیے۔ نفس تو گھوڑا ہے' گھوڑے پر چڑھ کر تم جہاد کرو' اسے اللہ کے دین کے لیے استعمال کرو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ تمہارا اس کے اوپر کنٹرول ہو۔ تو مجرد روزہ کی مشق ضبطِ نفس کے لیے ہے' جس کے لیے دینی اصطلاح تقویٰ (بچنا) ہے' یعنی نفس کے حملوں سے بچنا۔ لہٰذا حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ)) ''روزہ ڈھال ہے''۔ جیسے ڈھال سے آپ تلوار کے وار کو روکتے ہیں' سامنے سے اگر کوئی نیزہ لے کر آ رہا ہے تو اس کا وار آپ ڈھال پر روک لیتے ہیں' اسی طرح نفس کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے روزے کی مشق دی گئی ہے۔ پہلے ہر مہینے میں تین دن یہ مشق کرائی گئی ۔ اس میں ٹھنڈے دن بھی آ گئے' گرم دن بھی آ گئے۔ روزے کی فرضیت کے پہلے حکم میں کچھ رعایتیں بھی رکھی گئیں' لیکن جب یہ بات مزاجوں میں کچھ راسخ ہو گئی تو پھر رمضان کے روزوں کا حکم دیا گیا۔

'' گنتی کے چند دن'' کا مفہوم

فرضیتِ صیام کے پہلے حکم کے ضمن میں ارشاد ہوا : {اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ} ''یہ گنتی کے چند دن ہیں''۔ ہمارے جدید مفسرین اور مترجمین نے اکثر و بیشتر یہاں بڑی ٹھوکر

کھائی ہے کہ وہ ان دو آیات (۱۸۳'۱۸۴) کو بھی صومِ رمضان سے متعلق سمجھتے ہیں۔ مَیں اپنے نوجوانی کے دور سے' جبکہ مَیں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا اوردرسِ قرآن دیا کرتا تھا' اس رائے کو درست نہیں سمجھتا تھا' بلکہ میرا وجدان یہ

تھا کہ ان دو آیات کا تعلق ایامِ بیض کے تین روزوں سے ہے۔ بعد میں مجھے اسلاف سے اپنی رائے کی توثیق حاصل ہو گئی جب میرے علم میں آیا کہ بیہقی وقت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی بھی اس ضمن میں یہی رائے ہے اور امام فخر الدین رازیؒ کی ''تفسیر کبیر'' میں بہت سے تابعین کی یہی رائے نقل ہوئی ہے کہ یہ رمضان کے روزوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایامِ بیض کے تین روزوں کا ذکر ہے۔ فرمایا:{اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ} '' گنتی کے چند دن ہی تو ہیں ! '' ظاہر ہے تیس دنوں کو تو گنتی کے چند دن نہیں کہہ سکتے۔ ویسے بھی ''مَعْدُوْدٰتٍ'' جمع قلت کا وزن ہے اور اس کا اطلاق نو (۹)تک کے عدد پر ہو سکتا ہے' اس سے زائد پر نہیں۔ تو یہ تین دن کے روزے تھے۔

اس موقف کی تائید اگلے رکوع میں وارد ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں حج کا ذکر آیا ہے۔ آیت ۲۰۳ میں منیٰ میں قیام کے بارے میں فرمایا:{وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ}''اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں''۔ یوں سمجھئے کہ مناسکِ حج ادا ہو گئے۔ وقوفِ عرفہ بھی ہو گیا' قیامِ مزدلفہ بھی ہو گیا' قربانی بھی ہو گئی' حلق بھی ہو گیا' طوافِ زیارت بھی ہو گیا۔ اب اس کے بعد تین دن یا دو دن منیٰ میں مزید قیام ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا: {وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ} ''اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں''۔{فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ}''پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔ {وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ} ''اور جو کوئی مؤخر کردے (تین دن پورے کرے) تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں''۔ تو اصل میں {اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ} وہ تین دن ہیں جن کے بارے میں مَیں نے آپ کو بتا دیا۔

آگے اس ضمن میں دی گئی رعایتوں کا ذکر فرمایا: {فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ} ''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں''۔ {وَ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ؕ}

''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو ان کے ذمہ (ایک روزے کا) فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے''۔ اس رعایت کا تعلق بھی ایامِ بیض کے روزوں سے تھا کہ چونکہ تم ابھی روزہ رکھنے کے عادی نہیں ہو' لہٰذا اگر طبیعت آمادہ نہ ہو' اگرچہ نہ سفر پر ہو اور نہ بیمار ہو' تو فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلا کر روزہ قضا کر سکتے ہو۔ اگر بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر لو' ورنہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ آگے فرمایا :{فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ ؕ} ''پھر جو اپنی خوشی سے زیادہ نیکی کمائے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے''۔ یعنی ایک کے بجائے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلائے' یا روزہ بھی رکھے اور مسکینوں کو بھی کھلائے تو یہ نورٌ علیٰ نور والا معاملہ ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی ارشاد فرمایا: {وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿ ۱۸۴ ﴾} ''لیکن اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو۔''

رمضانِ مبارک : نزولِ قرآن کا مہینہ

اب اگلی آیت میں ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم آیا۔ روزے کی یہ عبادت کسی بھی مہینے میں فرض ہو سکتی تھی ' سارے مہینے اللہ کے ہیں' لیکن اس کے لیے ماہِ رمضان کا انتخاب اس لیے فرمایا گیا کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:((رَمَضَانُ شَهْرُ اللهِ وَشَعْبَانُ شَهْرِیْ)) ''رمضان اللہ کا مہینہ ہے اور شعبان میرا مہینہ ہے''۔ چنانچہ آپ ﷺ ماہِ شعبان میں کثرت سے نفلی روزے رکھتے تھے۔گویا رمضان کی تیاری ہو رہی ہے۔ آپ ﷺ کسی اور مہینے میں اتنی کثرت سے نفلی روزے نہیں رکھتے تھے جتنے شعبان میں رکھتے تھے۔

ارشاد ہوا :{شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ} ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔ اور قرآن کی مدح کیا ہے؟ {هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ}''جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں''۔ قرآن لوگوں کے لیے ہدایت و رہنمائی بنا کر نازل کیا گیا ہے اور یہ ہدایت و

رہنمائی بھی گنجلک' مبہم یا پہیلیوں کے انداز میں نہیں' منطق کی زبان میں نہیں' بلکہ سادہ زبان میں' بڑے روشن' بہت واضح اور حق و باطل میں تمیز کر دینے والے مضبوط دلائل کی صورت میں ہے۔یہاں قرآن حکیم کی متعدد شانوں میں سے تین اہم ترین شانیں بیان فرما دی گئیں کہ یہ صحیح راہ کی طرف راہنمائی کرنے والی کتاب یعنی الہدیٰ ہے' یہ بینات پر مشتمل ہے' اور یہ الفرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب ہے۔

یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ ''رمضان کے مہینے میں قرآن نازل ہوا'' تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضور ﷺ پر یہ قرآن تیئیس (۲۳) سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ چنانچہ یہاں وارد ہونے والے الفاظ کے دو مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماہِ رمضان میں وہ رات ہے جسے ''لیلۃ القدر'' کا نام دیا گیا ہے اور جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر اور افضل ہے۔ اس رات میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ جبکہ ایک مفہوم یہ ہے کہ اس مبارک رات میں پورا قرآن لوحِ محفوظ یا کتابِ مکنون سے سمائے دنیا تک اُتار دیا گیا جو ہمارا سب سے قریب کا آسمان ہے۔ پھر یہاں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ پر جستہ جستہ نازل کرتے رہے۔

عربی میں ''اِنْزَال'' اور ''تَنْزِیْل'' میں وہی فرق ہے جو اِعْلَام اور تَعْلِیْم میں ہے۔ ''اِعلام'' ہے کسی کو کچھ بتا دینا' جبکہ ''تعلیم'' ہے کسی کو کچھ سکھانا ۔ سکھانے میں محنت کرنی پڑتی ہے' بار بار سمجھانا پڑتا ہے' ذہن نشین کرانا پڑتا ہے۔ اسی طرح اِنزال دفعۃً کسی چیز کو اتار دینا ہے' اور تنزیل (تعلیم کے وزن پر) تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں یہ دونوں الفاظ آئے ہیں۔ قرآن مجید میں لیلۃ القدر کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا:{اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ } ''اَنْزَلْنٰہُ'' انزال سے ہے۔آیت زیر مطالعہ {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ}میں ''اُنْزِلَ'' بھی انزال سے ہے۔ لیکن سورۂ بنی اسرائیل میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:{وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ ۱۰۶ } ''اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ آپ ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سنائیں اور اسے ہم نے (موقع موقع سے)

بتدریج اتارا ہے''۔یہاں نَزَّلْنٰہُ تَنْزِیْلًا فرمایا۔سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوا:{وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رضوان اللہ علیہم اجمعین نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ رضی اللہ عنہاعَلٰي قَلْبِكَ...} ''یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے۔ (اے نبی ﷺ !) اس قرآن کو لے کر آپ کے دل پر امانت دار روح (مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں)اُتری ہے...'' آپ ﷺ کے قلب مبارک پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔یہ تنزیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے کلام کی مدح و تعریف اور عظمت کے بیان یہ نکئی انداز اور اسلوب اختیار فرمائے ہیں۔ اس موضوع پر میری تقاریر اور کتابچے موجود ہیں۔

رمضانِ مبارک میں روزہ کی فرضیت

آگے فرمایا:{فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ} ''پس جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو اُس پر لازم ہے کہ وہ اس کے روزے رکھے''۔ اس حکم کے آنے کے بعد اب یہ اختیار نہیں رہا کہ اگر خود روزہ نہ رکھو تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ ہاں اس اختیار کو حضور ﷺ نے اپنے حکم سے اُن مَردو زن کے لیے قائم رکھا جو بہت بوڑھے ہوں اور ان سے فاقہ برداشت نہ ہو سکتا ہو' اس میں جان جانے کا اندیشہ ہو۔ ان کے لیے رخصت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ یا کوئی ایسے مرض میں مبتلا ہے جس سے شفایاب ہونے کی اب توقع نہیں ہے۔ مثلاً ذیابیطس اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ بھئی اب تو آپ کو اس کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے اور اس کے ساتھ یہ احتیاطیں کرنی ہیں۔اور ذیابیطس کا مریض فاقہ برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے جو پہلے ایک اضافی رعایت تھی اسے حضور ﷺ نے باقی رکھا' ورنہ اب رمضان کے روزے فرض ہیں۔

آگے وہی الفاظ دُہرا کر لائے گئے جو پہلے حکم کے ساتھ آئے تھے :{وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ} ''اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں(روزے رکھ کر) گنتی پوری کر لے''۔ ان الفاظ کی تکرار اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ یہ آیات ایک وقت میں نازل نہیں ہوئیں' بلکہ یہ دو مختلف

اوقات میں نازل ہوئیں اور ترتیب میں حضور ﷺ کے حکم سے یہاں رکھ دی گئیں۔ یہاں پر وہ سابقہ رعایت ابھی تک برقرار ہے کہ اگر کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو روزہ چھوڑ دے اور اسے دوسرے دنوں میں رکھ لے۔ لیکن اس ضمن میں ہمارے ہاں بعض لوگوں کا رویّہ بڑا متشددانہ ہوتا ہے اور وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ عام طور پر سفر میں بھی لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ ۱۰۴ بخار چڑھا ہوا ہے' لیکن روزہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ گویا بڑا تقویٰ دکھا رہے ہیں اور بڑی دینداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اگر اللہ نے اجازت دے رکھی ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہے۔ اس لیے فرمایا: {یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ} ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے' سختی نہیں چاہتا ہے''۔ لیکن لوگ اپنے اوپر سختی کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ)) ''سفر میں روزہ رکھنا نیکی میں سے نہیں ہے''۔ نیکی کا یہ تصوّر تو تم نے اپنے دل میں گھڑ لیا ہے۔ آج کل کا سفر اگرچہ باسہولت ہوتا ہے لیکن سفر تو سفر ہے۔ گھر میں جو سکون و اطمینان ہوتا ہے وہ کبھی سفر میں نہیں ہوتا۔ انسان کے معمولات بدلے ہوئے ہوتے ہیں' لہٰذا اللہ نے جو رعایت دی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس ضمن میں ایک انتہا یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر سفر میں روزہ رکھا تو روزہ ہوا ہی نہیں' اس کی قضا دینی پڑے گی' کیونکہ وہ روزہ تم پر فرض نہیں تھا' اور جو تم نے رکھا وہ تو نفلی ہو گیا اور تمہارا فرض روزہ قضا ہو گیا 'لہٰذا اب تمہیں قضا دینی پڑے گی۔ واللہ اعلم! بہرحال ارشاد ہوا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے' سختی نہیں چاہتا۔''

اس کے فوراً بعد فرمایا: {وَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ} ''(اس لیے تمہیں یہ طریقہ بتایا جا رہا ہے) تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو''۔ یہ رعایتیں ضرور ہیں' لیکن چھوٹ نہیں ہے' تعداد بہرحال پوری کرنی ہو گی۔ اور اس معاملے میں اس قدر سختی ہے کہ اگر آپ نے رمضان المبارک کا کوئی روزہ بغیر کسی عذر کے چھوڑ دیا یا کوئی روزہ بلاعذر کسی وجہ سے توڑ دیا تو اس کی قضا ساٹھ روزے ہوں گے۔ اس کے بدلے میں آپ کو متواتر ساٹھ

روزے رکھنے ہوں گے۔

آگے فرمایا: {وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمْ} ''اور تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اس پر کہ جو ہدایت اس نے تمہیں دی ہے''۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ کی تکبیر کرو' اللہ کی کبریائی کا اظہار کرو' اللہ کی بڑائی نافذ کرو۔ قرآن دیا گیا ہے تو اس کے احکام نافذ کرو' اس کے احکام پر عمل کرو' اس کے نظام کو قائم کرو! یہ تو بڑا اونچا مفہوم ہے۔ اور ایک اس کی عملی شکل یہ ہے کہ عید کے لیے جاتے ہوئے تکبیریں پڑھو' واپس آتے ہوئے تکبیریں پڑھو۔ تکبیر پڑھتے ہوئے ایک راستے سے جاؤ اور راستہ بدل کر دوسرے راستے سے واپس آؤ۔ لوگ اب ان آداب کو بھی بھول چکے ہیں۔

عید کی سویاں تو سب کو یاد ہیں‘ لیکن یہ یاد نہیں کہ عید کے لیے جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے تکبیریں کہنی ہیں: اَللّٰہُ اَکْبَرُ‘ اَللّٰہُ اَ کْبَرُ‘ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ پھر جب ہم عید کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں تو اس میں چھ اضافی تکبیریں ہیں۔ اہلِ حدیث کے نزدیک بارہ ہیں۔ یہاں فرمایا کہ یہ جو تم پر اللہ کا انعام ہوا ہے کہ اس نے تمہیں قرآن کی شکل میں ہدایت دی ہے تو اس پر اللہ کی تکبیر کرو۔ ساتھ ہی فرمایا:{وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿ ۱۸۵ ﴾} ’’اور تاکہ تم شکر کر سکو۔‘‘

رمضان کے دو متوازی پروگرام: صیام و قیام

آیت مبارکہ کا مذکورہ بالا ٹکڑا ذرا غور سے سمجھنے کا ہے۔ اصل میں رمضان مبارک کا جو دوگونہ پروگرام ہے‘ قرآن میں اس کی ایک شق بیان ہوئی ہے‘ جبکہ دوسری شق کی وضاحت محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔ اگر اس کا ذکر قرآن میں آجاتا تو یہ بھی فرض ہو جاتی۔ رمضان کے اس پروگرام کی دوسری شق ’’قیام اللیل‘‘ ہے۔ رمضان مبارک کے لیل و نہار کا دوگونہ پروگرام یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھا جائے اور رات کا اکثر حصّہ کھڑے ہو کر قرآن حکیم پڑھا جائے یا سنا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے شعبان کے آخری دن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خطبہ دیا تھا جس کے راوی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں ---- ان کو حضور ﷺ سے اس قدر قرب تھا اور

حضور ﷺ کو ان سے اتنی محبت تھی کہ آپؐ نے فرمایا کہ سلمان بھی ہمارے اہلِ بیت میں سے ہیں ---- وہ بیان کرتے ہیں: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِیْ آخِرِ یَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ: ’’ہمیں خطبہ دیا اللہ کے رسول ﷺ نے شعبان کے آخری دن‘ اور فرمایا:‘‘ ((یَا اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّکُمْ شَھْرٌ عَظِیْمٌ)) ’’اے لوگو! تم پر ایک بڑا عظمتوں والا مہینہ سایہ فگن ہو گیا ہے‘‘۔ ظل سائے کو کہتے ہیں۔ قَدْ اَظَلَّکُمْ کی بہترین تعبیر مجھے انگریزی کے اس محاورے میں ملتی ہے Coming events cast their shadows before: یعنی آنے والے واقعات اپنا کچھ سایہ پہلے سے بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ رمضان کا مہینہ ابھی شروع نہیں ہوا‘ ابھی تو شعبان ہے‘ لیکن رمضان کا عکس آنا شروع ہو گیا ہے۔ تو فرمایا: تم پر سایہ فگن ہو گیا ہے ایک بڑا عظمتوں والا مہینہ((شَھْرٌ مُبَارَکٌ)) ’’بڑی برکتوں والا مہینہ‘‘۔ ((شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ)) ’’وہ مہینہ جس میں ایک رات وہ بھی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے‘‘ یعنی لیلۃ القدر۔ ((جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً)) ’’اللہ نے اس کا روزہ رکھنا فرض کر دیا ہے‘‘۔ ((وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا)) ’’اور اس کی راتوں کو کھڑا رہنا تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے‘‘۔ قیام اللیل تو ہر شب میں نفل ہے‘ آپ کسی بھی رات اُٹھ کر تہجد پڑھیں‘ اس کی بڑی فضیلت ہے‘ لیکن اس حدیث مبارک میں رمضان مبارک کی راتوں کے قیام کی اضافی ترغیب و تشویق اور تاکید ہے۔ چنانچہ الفاظ آئے ہیں: ((جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا)) ’’اللہ نے اس کا

روزہ فرض قرار دیا ہے اور اس کی راتوں کا قیام تطوع ٹھہرایا ہے''۔ حضور ﷺ نے صیام اور قیام دونوں کی نسبت اللہ کی طرف ٹھہرائی ہے۔

اب ہمیں قیام اللیل کی حقیقت سمجھنی ہے۔ قیام اللیل سے مراد ہے رات کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اور اس میں قرآن کی تلاوت کرنا۔ قیام اللیل کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلا حکم ان الفاظ میں ملا تھا: {یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۲﴾}''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! کھڑے رہا کرو رات کو

سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے''۔اب اگلی آیت میں اس کی تفصیل کی گئی: {نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ﴿۳﴾}''آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر لو''۔ آدھی میں سے کچھ کم کریں تو تہائی رات بنتی ہے۔{اَوْ زِدْ عَلَیْهِ} ''یا اس پر کچھ زیادہ کرو''۔ گویا کہ دو تہائی رات۔{وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ﴿۴﴾}''اور پڑھتے رہا کرو قرآن کو ترتیل کے ساتھ''۔ یعنی خوب ٹھہر ٹھہر کر' اس کے انوار کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے' اسے اپنے روح اور قلب پر اتارتے ہوئے۔ یہ ہے قیام اللیل۔

اسی سورۃ المزمل کے آخر میں فرمایا:{اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ ؕ}''(اے نبی ﷺ!) آپ کے ربّ کو خوب معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات کے قریب' کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کا بھی یہ معمول ہے''۔ گویا ایک تہائی رات سے کم پر ''قیام اللیل'' کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔چنانچہ اگر ((جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا)) پر عمل کرنا ہے تو پھر کم از کم ایک تہائی شب کا قیام تو کریں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دو تہائی اور آدھی شب قرآن کے ساتھ بسر کریں۔ قرآن کو پڑھیں' اسے اپنے قلب و روح پر اتاریں' اس کے انوار و تجلیات کو اپنے اندر جذب کریں' تب بات پوری ہو گی۔

اس سلسلے میں دو اور حدیثیں ملاحظہ کیجیے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: ((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ: اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ' فَیُشَفَّعَانِ)) (رواہ احمد والطبرانی والبیھقی)

حضرت عبدا للہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''روزہ اور قرآن (قیامت کے روز) بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے ربّ! میں نے اس شخص کو دن میں کھانے پینے اور

قرآن کریم کی سفارش جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس پر ذرا غور کیجیے :((وَيَقُوْلُ الْقُرْآنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ)) ''قرآن کہے گا :مَیں نے اسے روکے رکھا نیند سے رات کے وقت''۔اب خود ہی فیصلہ کیجیے کہ آپ گھنٹہ بھر میں جو تراویح پڑھ لیتے ہیں اس سے آپ کی نیند میں کوئی کمی ہوتی ہے؟ آج کل گیارہ بجے سے پہلے تو کوئی سوتا ہی نہیں' گویا رات ہی نہیں ہوتی' تو آپ نے نیند کی کوئی قربانی دی؟ ہاں ایک تہائی یا دو تہائی رات اگر جا گیں گے تو قربانی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں روزہ اور قرآن دونوں کی شفاعت کا مستحق بنائے۔ آمین !

اگلی حدیث میں دن کا روزہ اور رات کا قیام دونوں کو بالکل متوازی انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))(متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں)میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔''

صیام و قیام میں ''احتساب'' کا مفہوم

اس حدیث مبارک میں دن کا روزہ اور رات کا قیام' دونوں کے ساتھ ایمان اور

احتساب کی شرط بیان ہوئی ہے۔ ''اِحْتِسَابًا'' کے دو ترجمے ہیں۔ ایک یہ کہ اجر و ثواب کی نیت سے' اور دوسرے یہ کہ خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ۔ یعنی روزہ رکھ کر انسان اپنے نفس کا بھی احتساب کرتا رہے۔ یہ نہ ہو کہ روزہ بھی رکھا ہوا ہے اور جھوٹ بھی بول رہا ہے' دھوکہ بھی دے رہا ہے اور سودی کاروبار بھی کر رہا ہے۔ اس طرح اس کا روزہ کہاں ہوا؟ اس ضمن میں تین احادیث مبارکہ ملاحظہ کیجیے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ)) (رواہ البخاری و ابوداؤد و الترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص (روزہ کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے ۔''

ایسا شخص گویا فاقہ کر رہا ہے' اس کے روزے سے اسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ

لیجیے کہ اسی طرح اگر کوئی شخص رٹی رٹائی سی کوئی چیز سن رہا ہے' اس نے نہ تو قرآن کو سمجھا نہ اس پر کوئی غور کیا' تو وہ رات کا جاگنا بھی بے کار ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ : ((کَمْ مِنْ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صِیَامِہٖ اِلَّا الظَّمَأُ وَکَمْ مِنْ قَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ قِیَامِہٖ اِلَّا السَّھَرُ)) (رواہ الدارمی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ جنہیں سوائے پیاس کے اُن کے روزہ سے کچھ نہیں ملتا' اور کتنے ہی قیام کرنے والوں کو ماسوا بے خوابی کے ان کے قیام سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ : ((رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صِیَامِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ' وَرُبَّ قَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ قِیَامِہٖ اِلَّا السَّھَرُ)) (رواہ ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہت

سے روزہ داروں کو ان کے روزہ سے سوائے بھوک کے کچھ حاصل نہیں ہوتا' اور بہت سے قیام کرنے والوں کو رت جگے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔''

دونوں حدیثیں ایک ہی مفہوم کی حامل ہیں کہ بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے سوائے بھوک پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا نہ کوئی روزہ ہے نہ کوئی ثواب ہے' نہ کوئی روحانیت ہے نہ کوئی تقویٰ ہے۔ اسی طرح بہت سے رات کو کھڑے رہنے والے بھی ایسے ہیں جنہیں اپنے قیام سے سوائے رت جگے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ نیند تو گئی ' لیکن ملا کچھ نہیں۔ قیام اللیل تو تب ہو گا جب قرآن آپ کے ذہن میں اُترے' آپ کے قلب میں اُترے' آپ کے اندر اس کے انوار جذب ہوں۔ تب تو کوئی فائدہ ہے' ورنہ کوئی فائدہ نہیں۔

متذکرہ بالا احادیث میں آپ نے دیکھا کہ رمضان المبارک کے دو گونہ پروگرام میں صیام اور قیام متوازی اور برابر برابر ہیں' لیکن ہمارے ہاں ''قیام اللیل'' کی جو صورت تراویح کے نام سے رائج ہے یہ کسی طرح بھی دن بھر کے روزے کے متوازی اور برابر نہیں ہے۔ لہٰذا غور طلب بات ہے کہ اس کا حل کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا قیام اللیل

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کوئی نماز تراویح نہیں تھی' کوئی اجتماعی نماز نہیں تھی' بلکہ ترغیب و تشویق تھی کہ اپنے طور پر رات کو جاگ کر قیام کرو' اس میں قرآن پڑھو اور اسے سمجھو' اس پر غور کرو' تدبر کرو۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی قیام اللیل کی

کوئی اجتماعی صورت نہیں تھی۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں تین رات باجماعت نوافل پڑھائے ہیں‘جنہیں آپ تراویح کہہ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ نوافل تہجد کے وقت پڑھائے اور ان کی تعداد آٹھ تھی۔ اس لیے کہ وہ آپؐ کی تہجد تھی‘ جس میں ہمیشہ آٹھ ہی نفل ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کی تہجد ہمیشہ آٹھ نفل اور تین وتر کل گیارہ رکعتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک رمضان مبارک میں آپؐ نے تین رات تہجد کی جماعت کرا دی تھی۔ چوتھی رات

حضور ﷺ برآمد نہیں ہوئے۔ لوگ کھنکارتے بھی رہے کہ شاید حضور ﷺ کی آنکھ نہیں کھلی‘ لیکن حضور ﷺ باہر تشریف نہیں لائے۔ صبح آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں مسلسل یہ نماز پڑھاتا تو یہ تم پر فرض ہو جاتی اور یہ تمہارے لیے بہت مشقت والی بات ہوتی۔ اس لیے کہ مسلمان غریب بھی ہیں‘ امیر بھی ہیں۔ دن بھر مشقت کرنے والے لوگ اگر دن کا روزہ ہی رکھ لیں تو بہت بڑی بات ہے۔ مزدور بیچارہ جو تعمیر میں لگا ہوا ہے‘ وہ دن کا روزہ رکھنے کے بعد رات کو بھی دو تہائی‘ ایک تہائی یا آدھی رات تک جاگے‘ یہ اس کے لیے ممکن نہیں۔

ہمارے اہل حدیث حضرات اسی حدیث کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ تراویح تو بس آٹھ رکعت ہے! حالانکہ بھئی اگر آپ کو یہی حدیث لینی ہے تو پھر صرف تین دن تراویح پڑھیں‘ اور پڑھیں بھی صرف تہجد کے وقت۔

تراویح اور اجماعِ اُمّت

تراویح کا معاملہ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں ایک رات رمضان مبارک کے دوران مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوئے تو آپؓ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک کونے میں کھڑے ایک امام کے پیچھے قرآن سن رہے ہیں‘ کچھ لوگ دوسرے کونے میں اسی طرح استماعِ قرآن میں مشغول ہیں۔ اس طرح پوری مسجد میں بیک وقت کئی جماعتیں ہو رہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیام اللیل کا یہ نقشہ دیکھا تو فرمایا: کیوں نہ ان کو ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا جائے! چنانچہ آپؓ نے فیصلہ کیا کہ عشاء کے فوراً بعد سب مل کر بیس رکعت نماز باجماعت ادا کریں گے۔ یہ اجتہاد ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا‘ اور اہلِ سُنّت والجماعت کے چاروں فقہی مسالک حنفی‘ مالکی‘ شافعی‘ حنبلی سب اس پر متفق ہیں۔ آٹھ رکعات تراویح اہلِ حدیث حضرات نے نئی بات نکالی ہے۔ ہمارے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان رہنا چاہیے:((عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ))’’تم پر لازم ہے میری سُنّت کی پیروی اور میرے خلفائے راشدین کی سُنّت کی پیروی‘ جو ہدایت یافتہ ہیں‘‘۔ خلیفۂ راشد کے اجتہاد کو اجماعِ اُمّت کی حیثیت حاصل

ہے۔ ہم اہلِ سُنّت والجماعت ہیں‘ لہٰذا سُنّت ِنبویؐ کے بھی پابند ہیں اور خلافت ِراشدہ کے دوران ہونے والے اجماعِ اُمّت کے بھی پابند ہیں۔

سعودی عرب کا معاملہ یہ ہے کہ چونکہ وہاں کا سرکاری مذہب حنبلی ہے‘ لہٰذا مسجد ِنبویؐ اور مسجد ِحرام دونوں جگہ بیس تراویح ہوتی ہیں۔ البتہ محلوں کے اندر جو مساجد ہوتی ہیں ان میں آٹھ آٹھ تراویح پڑھی جاتی ہیں اس لیے کہ وہاں پر عوام اور علماء کی اکثریت اہلِ حدیث ہے۔ البتہ رمضان مبارک کے آخری عشرے میں حرمین شریفین میں بیس تراویح کے علاوہ ایک قیام اللیل مزید ہوتا ہے‘ جو گویا رسول اللہ ﷺ کی متذکرہ بالا سُنّت پر جزوی طور پر عمل ہے۔ یہ بڑی پیاری نماز ہے جو نصف شب کے بعد ’’قیام اللیل‘‘ کے نام سے ادا کی جاتی ہے اور اس میں آٹھ نوافل کے اندر تین سوا تین پارے روزانہ پڑھے جاتے ہیں اور اس طرح ایک اور اضافی ختم قرآن ہو جاتا ہے۔مَیں نے ۱۹۷۱ء میں اس میں شرکت کی تھی اور اس کی لذت مجھے آج تک یاد ہے۔

روح کی غذا کا اہتمام

اب یہ جو رمضان کا دوگونہ پروگرام ہے‘ دن کا روزہ اور رات کا قیام بالقرآن‘ اس کا حاصل کیا ہے؟ پہلا حاصل تو یہ ہے: {لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾}’’تاکہ تم شکر کر سکو‘‘۔ تمہارے اندر قرآن کی عظمت جاگزیں ہو جائے۔ قراء ت و استماعِ قرآن سے ہماری پیاسی روح سیراب ہو گی۔ ہمارا جسم زمین سے آیا ہے‘ اور اسی زمین سے ہمارے لیے زندگی کی تمام ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ ہمیں پینے کو پانی یہیں سے مل رہا ہے‘ ہماری تمام خوراک براہِ راست یا بالواسطہ زمین ہی سے حاصل ہو رہی ہے۔ جبکہ ہماری روح اللہ کے پاس سے آئی ہے۔ ہمارا جسم تو اس زمین سے آیا ہے اور یہیں چلا جائے گا‘ ازروئے الفاظِ قرآنی:{مِنۡہَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾}(طٰہٰ) ’’اسی (مٹی) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں دوبارہ لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں (قیامت کے دن) دوبارہ اُٹھا کھڑا کریں گے‘‘۔ جبکہ ہماری روح کا معاملہ یہ ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۔ ہماری روح اللہ کے پاس سے آئی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا :{وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ} (آیت ۸۵) ’’اور یہ آپؐ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ روح تو میرے ربّ کے امر میں سے ہے‘‘۔یہ زمین میں دفن ہونے والی شے نہیں ہے‘ یہ زمینی نہیں آسمانی شے ہے اور وہیں لوٹ جاتی ہے۔

اس روح کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے‘ لیکن اس طرف ہماری توجّہ ہی نہیں ہوتی۔ ہمیں جسم کی تو ہر وقت فکر ہے۔ بھوک لگ رہی ہو فوراً کھانے کی طرف لپکتے ہیں‘ جسم کے دوسرے تقاضے بھی فوری طور پر پورے کرنے کی کوشش کرتے ہیں‘ لیکن روح کی فکر ہم نہیں کرتے۔ چنانچہ ہماری روح دب جاتی ہے‘ مضمحل ہو جاتی ہے‘

کمزور ہو جاتی ہے‘ بے ہوش ہوجاتی ہے‘ یہاں تک کہ مر بھی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے :{فَاِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی} (الروم:۵۲) ’’پس (اے نبی ﷺ !) آپ ان مُردوں کو نہیں سنا سکتے‘‘۔ یہ مُردہ ہیں‘ انہیں زندہ مت کہو۔ ان میں جان تو ہے‘ روح نہیں ہے۔ ان کی روح مر چکی ہے۔ روح ان کے دلوں کے اندر دفن ہو چکی ہے۔ لیکن اگر یہ روح ابھی مری نہیں ہے‘ کمزور ہے‘ تو اسے آپ غذا دیں گے تو اس کے اندر طاقت آئے گی۔ جس طرح جسم کی غذا زمین سے آتی ہے اسی طرح روح کی غذا آسمان سے آتی ہے۔ چونکہ وہ خود آسمان سے آئی ہے لہٰذا وہیں سے اس کی غذا آتی ہے۔ قرآن اس کی غذا ہے۔ چنانچہ اس قرآن کے ذریعے سے راتوں کو کھڑے رہ کر اس روح کو تقویت دو‘ اسے مضبوط کرو‘ اسے طاقت مہیّا کرو۔ مرغن کھانوں سے جسم میں طاقت ضرور آتی ہے لیکن اس سے روح دب جاتی ہے۔ جتنا نفس کا دباؤ بڑھے گا‘ روح اتنی ہی دب جائے گی۔ دن بھر روزہ رکھنے سے آدمی کا جسم کچھ نہ کچھ مضمحل ہو جاتا ہے۔ چاہے سردی کا روزہ ہو‘ شام کے وقت ایک اضمحلال ہوتا ہے۔ روزے سے اگر جسم کا وزن کچھ کم ہوا تو روح کو کچھ ریلیف ملا۔ پھر آپ نے رات کو کھڑے ہو کر قرآن کے ذریعے سے اس کی آبیاری کی تو وہ تروتازہ ہوگئی۔ جب وہ تروتازہ ہوجاتی ہے تو پھر وہ اپنے ربّ کی طرف متوجّہ ہو جاتی ہے۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟

یہی وجہ ہے کہ آگے فرمایا:{وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ} ’’(اے نبی ﷺ !)جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (ان کو بتا دیجیے) مَیں تو قریب ہی ہوں‘‘۔ مَیں دُور نہیں ہوں۔{اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۫} ’’مَیں ہر دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں‘ جب اور جہاں مجھے پکارے‘‘۔ صیام و قیام کے نتیجے میں جب ایک بندۂ مؤمن کی روح کو تقویت حاصل ہوئی اور اس کے قلب میں شکر کا جذبہ اُبھرا تو اس کا عین تقاضا ہے کہ وہ اب اپنے پروردگار کی طرف متوجّہ ہو اور اس کے سامنے اپنا دستِ سوال دراز کرے۔

اب بندے کے دل میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میرا رب مجھ سے کتنی دور ہے؟ اس آیت میں اس سوال کا جواب دو ٹوک انداز میں دے دیا گیا۔ یہاں گویا مذہبی استحصال سے نجات کا ایک میگنا کارٹا دے دیا گیا ہے۔ دنیا میں استحصال کی مختلف صورتیں رائج ہیں۔ ایک سیاسی استحصال ہوتا ہے‘ جبکہ ایک مذہبی استحصال ہے جس میں اللہ اور بندے کے درمیان پردے حائل کر دیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی استحصال کا بہت بڑا ادارہ (institution)بزرگوں کے مزارات ہیں۔ ان کے مجاوروں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ یہاں جو پیر دفن ہیں وہ چونکہ بڑے اونچے رتبے والے ہیں لہٰذا یہاں چادر چڑھاؤ‘ نذرانہ جمع کراؤ‘ کچھ پیسے ہمیں دو‘ ہم ان کے مجاور ہیں‘ تو اللہ تمہاری دعا سنے گا۔ بعینہٖ یہی موقف بتوں کے پجاریوں کا ہوتا ہے۔ سومنات میں جو بہت بڑا بُت نصب تھا اس کے پجاری لوگوں کا مذہبی استحصال کر رہے تھے کہ ہماری مٹھی گرم کرو‘ یہاں چڑھاوے چڑھاؤ‘ خزانے میں سونے

چاندی کے سکے ڈالو تو تم پر بھگوان کی نظر کرم ہو گی۔ چنانچہ خزانے کے اندر بے شمار پیسہ جمع تھا جو اُن پجاریوں کی ملکیت تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے وہ بت توڑا تو سارا خزانہ ساتھ لے گیا۔

عجیب بات ہے ' لطیفہ بھی ہے 'کہ یہ جو مذہبی استحصال کرنے والے طبقات ہیں وہ سب ''پ'' سے بنتے ہیں۔ (i)پجاری (ii)پروہت(iii)پنڈت (iv)پیر (v)پوپ۔

دیکھئے یہ پانچ پ (PPPPP)جمع ہو گئی ہیں۔{اُجِیبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ}کے الفاظ کے ذریعے انسان کو اس مذہبی استحصال سے یکسر آزادی عطا کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میرا گھر ہر وقت کھلا ہے ' جب چاہو مجھ سے بات کرو۔ نماز پڑھنے کے لیے اور قرآن کی تلاوت کے لیے تو وضو کی ضرورت ہوتی ہے 'جبکہ مجھے پکارنے کے لیے وضو کی ضرورت بھی نہیں۔ جب چاہو مجھے پکارو ! ''اِذَا دَعَانِ''کا صحیح ترجمہ ہو گا ''جہاں اور جب'' (there and then)''میں تو پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جہاں اور جب وہ مجھے پکارے''۔یہ تو تم ہی غافل ہو کہ ہماری طرف توجّہ ہی نہیں کرتے' تمہاری ساری توجّہ دنیا کی طرف ہے' دنیا کے عیش اور اس کی سہولتوں کی طرف ہے کہ دنیا میں ہماری حیثیت زیادہ سے زیادہ ہو جائے' ہمارا رعب زیادہ ہو جائے۔ ہماری طرف تمہاری توجّہ کہاں ہے؟

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ راہروِ منزل ہی نہیں !

اللہ کی طرف متوجّہ ہونے والا ہمارا نفس نہیں ہوسکتا' ہماری روح ہو سکتی ہے' اور روح ہم نے دبا رکھی ہے۔ ہماری روح کمزور ہے' مضمحل ہے' کیا پتا مر ہی چکی ہو۔ہم یہ نہیں دیکھتے کہ حلال کھا رہے ہیں یا حرام کھا رہے ہیں۔ ہم نے بینک سے قرضہ لے کر مکان تو بڑا شاندار بنا لیا لیکن کیا یہ حلال ہے؟ ہم نہیں سوچتے کہ یہاں ہمارا ایک ایک لمحہ جو گزر رہا ہے وہ حلال زندگی کا گزر رہا ہے یا حرام زندگی کا؟ بینک سے قرضہ لے کر ہم نے بہت بڑا کاروبار بڑھا لیا' لیکن یہ تو سراسر حرام ہے۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ اس روح پر جو نفس کا بوجھ ہے' اس کے پائوں میں جو بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں' جب تک اسے ان سے آزاد نہیں کرائو گے وہ اللہ کی طرف متوجّہ نہیں ہو سکتی ؎

مجھ کو ہے تیری جستجو ' مجھ کو تری تلاش ہے
خالق مرے کہاں ہے تو؟ مجھ کو تری تلاش ہے !

ہم اپنے ہائی سکول کے زمانے میں پانچویں سے لے کر دسویں تک ‘چھ سال یہ نظم پڑھتے رہے۔ دنیا اپنے خالق کو تلاش تو کرتی ہے‘ لیکن اللہ کہتا ہے کہ میری تلاش میں تمہیں جنگل

میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔مَیں تو ہر جگہ ‘ہر آن موجود ہوں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی : {وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ} (الحدید:۴)’’وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو‘‘۔ گویا ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی !

اللہ تو تمہارے دل کے اندر موجود ہے۔ یہ جو تمہارے اندر روح ہے جس کا مسکن قلب ہے‘ اس روح کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ بالکل وہی ہے جو سورج کی کرن کا سورج کے ساتھ ہے۔ سورج کی کرن کروڑہا میل دُور سے چلی آ رہی ہوتی ہے‘ لیکن کیا اس کا تعلق سورج سے کٹ سکتا ہے؟ اسی طرح ہماری روح اللہ کے پاس سے آتی ہے لیکن یہ اللہ سے منقطع نہیں ۔ ہاں منقطع اُس وقت ہوتی ہے جب ہم اپنے گناہوں سے‘ اپنی غفلت سے‘ اپنے دلوں کو سیاہ کر لیتے ہیں‘ سخت کر لیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کثرتِ ذنوب سے انسان کا دل مٹھی کی مانند بند ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ آپ قبر میں مُردے کو اُتار کر مٹّی ڈال دیتے ہیں تو وہ قبر کے اندر بند ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں نفسِ انسانی کے بارے میں ارشاد ہے:{قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ۪ۙ﴿۹﴾ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا ﴿۱۰﴾} (الشمس) ’’کامیاب ہو گیا جس نے اس کا تزکیہ کر لیا (اسے پاک کر لیا) اور ناکام ہو گیا جس نے اس کو مٹی میں دبا دیا‘‘۔ یہ ہمارا مٹی کا وجود ہے‘ اس کے اندر ہم اپنی روح کو دبا دیتے ہیں۔

صیام و قیامِ رمضان کا حاصل

رمضان کے اس دوگونہ پروگرام کا حاصل کیا ہے؟ اس کے لیے اس حدیث قدسی کا مطالعہ کیجیے :

عَنۡ اَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ : قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : ((قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ : کُلُّ عَمَلِ ابۡنِ آدَمَ یُضَاعَفُ : اَلۡحَسَنَۃُ عَشۡرُ اَمۡثَالِھَا اِلٰی سَبۡعِمِائَۃِ ضِعۡفٍ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : اِلَّا الصَّوۡمَ فَاِنَّہٗ لِیۡ وَاَنَا اَجۡزِیۡ بِہٖ یَدَعُ شَھۡوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنۡ اَجۡلِیۡ

لِلصَّائِمِ فَرۡحَتَانِ : فَرۡحَۃٌ عِنۡدَ فِطۡرِہٖ ‘ وَفَرۡحَۃٌ عِنۡدَ لِقَاءِ رَبِّہٖ ‘ وَلَخُلُوۡفُ فِیۡہِ اَطۡیَبُ عِنۡدَ اللّٰہِ مِنۡ رِیۡحِ الۡمِسۡکِ))(صحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب فضل الصیام)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ’’ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان کے

ہر(نیک) عمل کو دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر روزے کا معاملہ دیگر نیکیوں سے مختلف ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور مَیں ہی اس کی جزا دوں گا۔ میری وجہ سے ہی وہ اپنا کھانا پینا چھوڑتا ہے اور شہوت کے جذبات کو روکتا ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں' ایک خوشی اس کے افطار کے وقت اور ایک خوشی اپنے ربّ کی ملاقات کے وقت۔ اور یقیناً اس کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔''

اس حدیث کی روشنی میں مَیں نے ''عظمت ِ صوم'' کے نام سے ایک کتابچہ تحریر کیا تھا۔ روزے کا روحِ انسانی سے تعلق سمجھنے اور عظمت ِانسان سے واقفیت کے لیے اس کتابچے کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ روزہ' رمضان مبارک اور قرآن مجید کی عظمت و فضیلت سے آگاہی کے لیے ''عظمت ِصیام و قیامِ رمضان مبارک'' اور ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا مطالعہ کیجیے۔

دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کی دعوت

میری آج کی گفتگو سے کوئی بات واضح ہوئی ہو اور آپ اگر واقعی چاہتے ہوں کہ رمضان کی برکتوں سے کسی درجے مستفیض ہوسکیں تو آپ اس مسجد میں نمازِ تراویح کے ساتھ ہونے والے دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کا فیصلہ کریں۔ یہ پروگرام اس مسجد میں گزشتہ اکیس سال سے ہو رہا ہے۔ ہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فتوے کے مطابق تراویح کی بیس رکعات پڑھتے ہیں۔ ہر چار رکعات میںجتنا قرآن پڑھا جانا ہو پہلے بیٹھ کر اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح سنتے ہیں اور پھر جب نماز میں امام صاحب اس کی قراءت کرتے ہیں تو یہ کسی نہ کسی درجے میں دل و دماغ کے اندر اتر رہا ہوتا ہے۔ چار تراویح سے فارغ ہو کر پھر

اس سے اگلے حصے کا ترجمہ سنا جاتا ہے۔ اس طرح چار یا پانچ گھنٹے میں دورۂ ترجمہ قرآن اور تراویح سے فراغت ہو جاتی ہے۔ شروع میں تو اس کام میں چھ گھنٹے صَرف ہوتے تھے' لیکن اس کے بعد ہم نے اسے ذرا مختصر کیا ہے۔ گزشتہ دو برس سے مَیں خود یہ کام چھوڑ بیٹھا ہوں' اس لیے کہ اب میری صحت اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میرے تین بیٹے یہ کام کر رہے ہیں۔ یہ تین بیٹے تو صلبی ہیں' جبکہ میرے سینکڑوں معنوی بیٹے بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ کراچی میں تو چالیس پچاس جگہ دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام ہوتا ہے۔ یہاں لاہور میں بھی پندرہ بیس جگہ تو لازمی ہو گا۔ اس کے علاوہ ملتان' فیصل آباد' جھنگ' راولپنڈی اور اسلام آباد میں بھی یہ پروگرام ہوتا ہے۔

مَیں نے جب اس پروگرام کا آغاز کیا تو اس وقت میرے سامنے ایک مثال موجود تھی۔ سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی خانقاہ میں رمضان مبارک کی راتیں اس انداز سے بسر کی جاتی تھیں کہ ہر چار رکعت تراویح کے بعد ایک طویل وقفہ ہوتا جس میں لوگ منتشر ہو جاتے اور انفرادی طور پر تلاوتِ قرآن' نوافل

اور ذکر و تسبیح میں مصروف رہتے۔ اس طرح تقریباً سحری تک لوگ تراویح اور دیگر اعمال میں مشغول رہتے۔ ہم نے یہ کیا کہ اس شب بیداری کو اجتماعی شکل دے دی اور دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام شروع کر دیا' تاکہ لوگ قرآن کے ساتھ جاگیں اور ان کا معاملہ ان قیام کرنے والوں کا سا نہ ہو جنہیں سوائے رت جگے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اگر وہ قرآن کے ساتھ جاگ رہے ہیں تو قرآن کے کچھ انوار اُن کے قلوب و اذہان میں اُتر رہے ہوں۔ یہاں اس بار دورۂ ترجمہ قرآن کی ذمہ داری عزیزم ڈاکٹر عارف رشید ادا کریں گے۔ آپ حضرات ہمت کریں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں' اور آٹھ تراویح پڑھ کر نہ جائیں بلکہ پوری بیس تراویح پڑھ کر جائیں۔ قرآن کا کچھ حصّہ سن لینا اور کچھ حصّہ چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے۔ قرآن تو سارا کا سارا رحمت ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کا عظیم ترین معجزہ ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

123

دُعا اور عبادت کا ربط و تعلق

ناظم آباد' کراچی کی ایک جامع مسجد میں

رمضان المبارک کا دوسرا خطابِ جمعہ

(بتاریخ: ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ / ۲۳ مئی ۱۹۸۶ء)

الحمد لله وكفىٰ والصّلاة والسّلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ خصوصًا علىٰ افضلهم وخاتم النبيّين محمد الامين وعلىٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعين ... امّا بَعد فقد قال الله تبارک وتعالىٰ:

اعوذ بالله من الشَّيطٰن الرَّجيم - بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

{وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾} (البقرة)

وقال الله عزّوجل: {وَ قَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾} (المؤمن)

وقال النبی ﷺ : ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (رواه الترمذی)

وقال ﷺ : ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (رواه الترمذی)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوا قَوْلِیْ

سورة البقرة کے ۲۳ویں رکوع میں روزے کا حکم بھی آیا ہے ، اس کی حکمت کا بیان بھی ہے اور اس کے تفصیلی احکام بھی آئے ہیں - انہی کے ذیل میں یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے جس کی اوّلاً تلاوت کی گئی ہے: {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ}

''اور (اے نبی ﷺ !) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (انہیں بتا دیجیے کہ) مَیں قریب ہی ہوں'' - کہیں دور نہیں ہوں - {اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ} ''مَیں جواب دیتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں) ہر دُعا کرنے والے کی دُعا کا جب بھی وہ مجھے پکارے (جب بھی مجھ سے دُعا کرے)'' {فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ} ''تو چاہیے کہ وہ بھی

میری پکار پر لبیک کہیں (یعنی میرے احکام کو مانیں اور تسلیم کریں)۔ ''{وَلْيُؤْمِنُوا بِيْ} ''اور مجھ پر پختہ ایمان اور یقین رکھیں'' {لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿ ۱۸۶ ﴾} ''تاکہ وہ رشد و فوز سے ہمکنار ہوں۔''

بظاہر اس آیت مبارکہ میں نہ روزے کا ذکر ہے نہ رمضان کا' لیکن کسی بھی باشعور ہستی کے کلام میں ربط کا ہونا ضروری ہے اور غیر مربوط کلام ایک باشعور ہستی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس سے بڑھ کر باشعور اور حکیم ہستی کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ کلام ربط سے خالی ہو! جن لوگوں نے ربط و تعلقِ آیات پر زیادہ توجّہ صَرف نہیں کی 'وہ یقیناً قرآن مجید کی حکمت و معرفت کے ایک بہت اہم پہلو سے محروم رہ گئے۔ بلاشبہ قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ پر علم و حکمت اور معرفت و عرفان کا ایک بیش قیمت موتی ہے۔ جیسے آپ کسی ہار میں موتیوں کو پروتے ہیں تو اس کے نظم و ترتیب سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے' اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید پر غور و فکر کے ضمن میں ضروری ہے کہ انسان دو باتوں کو ملحوظ رکھے۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ پر اپنی توجہات کو اس طرح مرتکز کر دے جیسے کسی نہایت لطیف اور خفیف ترین شے کے مشاہدے کے لیے مائیکرو سکوپ کو فوکس (focus) کر دیا جاتا ہے۔ آیت کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا حق ادا کیا جائے اور ان کی تراکیب پر تدبر و تفکر کر کے انہیں خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اس کا سیاق و سباق ملاحظہ کیا جائے اور اس ربط و تعلق سے آیت ِزیر مطالعہ میں جو نئے معانی اور نئی معرفت کا سراغ ملتا ہے اسے تلاش کیا جائے۔

سورۃ البقرۃ کے ۲۳ویں رکوع کی پہلی آیت میں مجرد روزے کا حکم اور اس کی حکمت کا بیان ہے: {يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿ ۱۸۳ ﴾} ''اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے''۔ دوسری آیت میں ابتدائی احکام ہیں۔ تیسری آیت میں رمضان المبارک کا ذکر ہے اور اس پورے مہینے کے روزوں کی فرضیت کا بیان ہے:

{شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ.....}

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر' اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ ...''

اس آیت کے بعد یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے جو زیر مطالعہ ہے۔ پھر اس سے اگلی آیت میں روزے کے تفصیلی احکام آئے ہیں' جو اس رکوع کی طویل ترین آیت ہے۔ درمیان میں جو یہ موتی ٹکا ہوا ہے ' اب ہم اپنی توجہات اس پر مرتکز کرتے ہیں۔

قربِ الٰہی کا جذبہ فطری ہے !

پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس آیت مبارکہ کا اصل مضمون دُعا کی عظمت ہے۔ جب کسی انسان کے دل میں اللہ کی طرف توجّہ اور انابت پیدا ہو جائے اور اس کے دل میں اپنے رب سے تقرب حاصل کرنے کا ایک جذبہ اُبھرے، تو نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے شخص کو سب سے پہلے تو یہ خوشخبری دیجیے کہ تمہارا ربّ کہیں دُور نہیں ہے۔ اس ربّ سے ہم کلام ہونے کے لیے کہیں جنگلوں میں جا کر دھونی رمانے، کہیں پہاڑوں کی کھوئوں میں جا کر ڈیرا لگانے یا کہیں برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر تپسیائیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب میں خدا کا جو بھی تصوّر رہا ہے ' اسی کے ساتھ یہ نظریہ بھی رہا ہے کہ خدا سے قرب حاصل کرنے کے لیے آبادیوں کو چھوڑنا، گھر گرہستی سے ترکِ تعلق اور تجرد کی زندگی ضروری ہے۔ چنانچہ آبادیوں اور گھروں کی آسائشوں کو

چھوڑو، کہیں جنگلوں میں جائو، کہیں غاروں اور کھوئوں میں خاص آسنوں کے ساتھ بیٹھ کر پرماتما سے لو لگائو، کہیں ہمالیہ کی کسی برفانی چوٹی پر جہاں سرد ہوائیں چل رہی ہوں، ننگے بدن بیٹھو یا کہیں کسی گڑھے میں اپنے آپ کو دفن کرو۔ یہ سو طرح کے جتن ہیں جو انسان اپنے تصوّرِ خدا کے مطابق اس سے قرب حاصل کرنے کے لیے کرتا رہا ہے۔ انسان اپنی دانست میں یہ ساری مشقتیں کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے جھیلتا ہے اور وہ ہے اپنے تصوّرِ خدا کے مطابق اس کا قرب حاصل کرنا۔ یہ انسان کی ایک فطری اور طبعی خواہش ہے۔

خواہ وہ اپنے رب کو صحیح طور پر پہچان نہ پایا ہو اور اس کی توحید کا بھی اسے صحیح ادراک نہ ہو سکا ہو، لیکن فطرتِ انسانی میں اپنے پیدا کرنے والے سے قرب و تعلق قائم کرنے کا جذبہ طبعی اور فطری طور پر موجود ہے۔ جیسے انسان چاہے یہ جانتا نہ ہو کہ بھوک کیا شے ہے لیکن اسے اس کا احساس بہرحال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ احساس نوزائیدہ بچے کو بھی ہوتا ہے جو بھوک کی وجہ سے روتا ہے تو ماں اسے دودھ پلاتی ہے ۔ یہ اصل میں اس کی جبلت اور فطرت ہے۔ چنانچہ جس طرح انسان میں اپنی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تقاضوں کا شعور اس کے اندر سے ابھرتا ہے، ایسے ہی ایک روحانی پیاس بھی انسان کے اندر سے اُبھرتی ہے۔ بہتوں میں یہ کم اُبھرتی ہے اور بہت سوں میں زیادہ اُبھرتی ہے۔ بہت سے لوگ اس دنیا میں اتنے مشغول ہوجاتے ہیں اور اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین و تکمیل میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی روح کی پکار سنائی نہیں دیتی، یا وہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ تاہم کوئی انسان، انسان ہونے کے ناطے اس سے بالکل محروم نہیں ہے۔

یہ پیاس اندر سے ابھرتی ہے جو لوگوں کو جنگلوں تک میں لے جاتی ہے۔ یہی پیاس تھی جس نے گوتم بدھ کو اپنے محل سے نکال کر نہ معلوم کن کن جنگلوں کی خاک چھنوائی اور اسے کن کن منیوں اور رشیوں کے پاس لے

کُئی اور اس سے کس کس کی جوتیاں سیدھی کرائیں۔ اس نے یہ سب کس لیے کیا؟ وہ کپل وستو کا راج کمار تھا۔ محل میں اسے تمام آسائشیں اور ہر طرح کا آرام حاصل تھا لیکن اس کے دل میں مکتی کے حصول او ر دکھ سکھ کی

حقیقت جاننے اور اپنے تصوّر کے مطابق اپنے ایشور کا گیان دھیان حاصل کرنے کا ایک جذبہ اُبھرا ۔پھر وہ اپنے محل' اپنی جوان بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ در حقیقت یہ فطرت کی ایک پیاس تھی جس نے اس سے یہ سب کچھ چھڑوا دیا۔ یہ فطرت کی پکار ہی تھی جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایران سے نکال کر شام کے مختلف علاقوں میں لے گئی' جہاں وہ مختلف راہبوں کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے دل میں اپنے ربّ کی معرفت کی ایک پیاس تھی۔ جس کے دل میں یہ ایک سچی پیاس کی حیثیت سے اُبھر آئے تو اسے اس وقت تک چین نہیں آسکتا جب تک کہ اس کی اس پیاس کی سیری کا کوئی بندوبست نہ ہوجائے۔

صیام و قیام : قربِ الٰہی کے جذبے کو اُبھارنے کا ذریعہ

اب اس آیت مبارکہ کا رمضان اور اس کے روزوں کے حکم و فرضیت سے جو ربط و تعلق ہے' اسے سمجھ لیجیے۔روزے کی حکمت بیان فرمائی گئی : ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' اور رمضان میں ان کی فرضیت کی دوسری حکمت بیان فرمائی ''لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ''۔ ہمارے اندر جو ملکوتی روح ہے اور اس کی جو پیاس ہے' وہ ہمارے جسمانی و حیوانی اور جبلی تقاضوں تلے دبی رہتی ہے۔ ہم کاروبارِ دنیا میں منہمک رہتے ہیں' دنیا کی آسائشوں اور کام و دہن کی لذتوں میں مستغرق رہتے ہیں۔ بھوک لگی تو کھانا کھا لیا اور پیاس لگی تو پانی پی لیا۔ جنسی جذبے نے جوش مارا تو جائز طریقہ سے اس کی تسکین کر لی ۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے میں انسان اس قدر منہمک رہتا ہے کہ روح کی پیاس اسے محسوس ہی نہیں ہوتی۔ رمضان کے روزوں کا پروگرام در حقیقت یہ ہے کہ پورے مہینے کے لیے معمولات کو اُلٹ دیا گیا ہے۔ اب دن میں بھوک اور پیاس برداشت کرو' جنسی خواہش کی تسکین پر قدغن لگائو۔ رات کو جبکہ آرام و استراحت کا شدید ترین داعیہ اُبھرتا ہے 'حکم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ کھڑے ہو جائو۔ گویا نفس کے جتنے تقاضے ہیں' ان کی مخالفت ہو رہی ہے ۔

دن بھر بھوک' پیاس اور جنسی تقاضے کی مخالفتیں آپ نے برداشت کیں' اب جو یہ بند کھلا اور آپ نے اپنے پیٹ کو بھرا تو حکم ہو گیا کہ کھڑے ہو جائو اور صلوٰۃ العشاء کے بعد

صلوٰۃ التراویح ادا کرو' جس کا اہلِ سُنّت کے تین فقہی مسالک میں بیس رکعات کا نصاب مقرر ہے۔ یہ کم سے کم نصاب ہے' ورنہ مطلوب یہ ہے کہ رمضان کی راتوں کا اکثر و بیشتر حصّہ قرآن مجید کے ساتھ جاگ کر گزارا جائے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامِ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان تو یہ تھی کہ:

{یٰٓاَیُّہَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۙ﴿۳﴾ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ﴿۴﴾}

''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) ! آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔ (یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔ یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں' اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جائیے۔''

تو اس کی کچھ مشابہت اور اس کا کوئی عکس تو ہمارے اندر رمضان المبارک کی راتوں میں آجائے۔ بہرحال' نمازِعشاء کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی اضافی مشقّت بھی اُس وقت ہے جب طبیعت پر کسل کا شدید ترین غلبہ طاری ہوتا ہے۔ یہ سب کیا ہے ! اسے مَیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ یہ reversal ہے۔ گیارہ مہینے جو عمل (process)جاری رہتا ہے اس میں ریورس گیئر ہے جو رمضان میں اس طور پر لگایا گیا ہے کہ اپنے نفس اور کام و دہن کے تقاضوں کو دبائو۔ جب یہ دبتے ہیں تو اندر سے روح کی پیاس ابھرتی ہے۔ جب یہ ابھرے تو پہلی خوشخبری دی گئی کہ جان لو کہ تمہارا ربّ تمہارے بالکل قریب ہے: {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ}

جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے' وہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے لیے وہاں کیسی کشمکش ہوئی۔ انسان نے اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے اور مطلق العنان بادشاہوں کے چنگل اور جاگیرداروں کے شکنجے سے نجات پانے کے لیے وہاں جو جدّوجُہد کی ہے اور پاپائیت کے منحوس اور بدترین نظام کا جو جُوا اُن کے کاندھوں پر رکھا ہوا تھا' اس سے رستگاری پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی ہیں ان کا تاریخ انسانی کے اہم ترین اور ناقابلِ فراموش واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ وہ نشاناتِ راہ ہیں جن پر چل کر حقوقِ انسانی کا منشور وجود میں آیا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت مبارکہ کی رو سے انسانی حقوق کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) یہ ہے کہ انسان کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ تمہارا ربّ تم سے دُور نہیں ہے' بلکہ نقشہ یہ ہے کہ :

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی !

یہ ہے بندے کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ ۔رب تو ہر دم' ہر آن مائل بہ کرم رہتا ہے۔ وہ تو ہم سے غافل نہیں ہے۔ ہم ہی اس سے غافل اور غائب ہو جاتے ہیں۔ عربی کا یہ شعر مَیں نے دسویں جماعت کے کورس میں پڑھا تھا کہ ؎

اَغِیبُ وَ ذُو اللَّطَائِفِ لَایَغِیبُ
وَاَرْجُوہُ رَجَاءً لَایَخِیبُ !

مَیں غائب ہو جاتا ہوں' وہ جو صاحب ِاَلطاف و کرم ہے وہ تو غائب نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر آن اور ہر جگہ موجود ہے۔وہ تو منتظر رہتا ہے کہ میرا بندہ میری طرف متوجّہ ہو۔یہ تو ہم ہیں جو اُس کی طرف رُخ ہی نہیں کرتے۔ ہم نے تو اس سے پیٹھ موڑی ہوئی ہے۔ ہم نے اس دنیا کو اپنا محبوب اور مطلوب بنا لیا ہے اور دولت کے پجاری بن گئے ہیں۔ ہم اپنے نفس کی غلامی میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم کہاں اُس ذُوالّلطائف ہستی کی طرف رخ کرتے ہیں ! حدیث قِدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ میرا بندہ اگر میری طرف چل کر آتا ہے تو مَیں اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو مَیں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو مَیں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ میرا بندہ اگر میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو مَیں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں' یعنی ملائکہ مقربین کی محفل میں اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کا ذکر فرماتے ہیں۔ علّامہ اقبال نے اسی کی ترجمانی ''جوابِ شکوہ'' میں اس طرح کی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں !

لیکن اگر بندے میں یہ پیاس ابھر آئے تو جب چاہے' جہاں چاہے اللہ سے ہم کلام ہو جائے جہاں کوئی حاجب نہیں' کوئی دربان نہیں۔ اس کی بھی علّامہ اقبال نے بہترین تعبیر کی ہے ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو !

ربّ اور بندے کے درمیان کوئی حائل نہیں !

یہ تو درحقیقت ہماری غفلت ہے' ہماری نادانی ہے۔ کچھ ہوشیار لوگوں کی چالاکی ہے کہ وہ استھان بنا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اگر تم کو اپنے رب سے ہم کلام ہونا ہے تو پہلے یہاں نذر و نیاز پیش کرو' ہماری مٹھیاں گرم کرو۔ ہم اس کے دربار کے حاجب اور دربان ہیں اور ہم جس بزرگ کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے ہیں' ان بزرگ کی اللہ کے یہاں بڑی رسائی ہے۔ تمہاری درخواست اللہ کے یہاں ان کے ذریعہ سے پہنچ سکے گی اور ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں۔

پہلے ہمیں خوش کرو‘ ہماری مٹھی گرم کرو تو تمہارا کام بنے۔

دنیا میں ساری لوٹ کھسوٹ اور جابرانہ استحصال صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں ہوتا‘ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا سب سے بڑا استحصال(exploitation) مذہب کے میدان میں ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ التوبہ میں بالکل واشگاف کر دیا گیا ہے ۔ فرمایا:{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ} (آیت ۳۴) ’’اے اہل ایمان ! اکثر علماء و مشائخ کا حال یہ ہے کہ لوگوں کے مال باطل طور طریقوں سے کھاجاتے ہیں اور اللہ کی (توحید کی) راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔‘‘ مذہب کے نام پر باطل اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کے اموال ہڑپ کرنے کے لیے اس طرح کے نظام بنائے گئے ہیں کہ یہ دیوی دیوتا ہیں‘ یہ ان کے مندر استھان ہیں‘ یہ ان کے بُت ہیں اور یہ ان کے پروہت ہیں‘ یہ ان کے پجاری ہیں‘ یہ پنڈت ہیں۔ کوئی پیر صاحب ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کی فلاں فلاں بزرگوں سے نسبت ہے ۔ کہیں پادری یا پوپ صاحب ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے

کہ یہ اللہ کے بیٹے مسیح ؑ کے چہیتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمت کرو گے ‘ ان کو راضی رکھو گے‘ ان کی نازبرداریاں اٹھائو گے تب ہی ایشور تک رسائی ہو گی۔ ان کو خوش کرو گے تب ہی اللہ خوش ہو گا۔ ان کو راضی رکھو گے تب ’’ابن اللہ‘‘ تمہارے کام آئیں گے ۔

مَیں حیران ہوا کرتا ہوں کہ مذہب کے نام پر جو استحصالی نظام ہیں وہاں یہ حرف ’’پ‘‘ ہی آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ حتیٰ کہ پادری کے لیے جو انگریزی لفظ priest ہے وہاں بھی یہ ’’پ‘‘ موجود ہے۔ اسی ’’پ‘‘ کی گردان آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ عربی زبان میں ’’پ‘‘ ہے ہی نہیں۔ اس نے تو اس ’’پ‘‘ کی ایسی جڑ کاٹی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو دین ہمیں دے کر تشریف لے گئے ہیں‘ اُس نے اس تصور کی بالکلیہ نفی کر دی ۔

اب آیت کی طرف پھر رجوع کیجیے۔ فرمایا : {وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ}’’اور (اے نبی ﷺ !) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (بتا دیجیے کہ) مَیں بہت قریب ہوں۔‘‘ یعنی جب بندے میں اپنے رب سے ہم کلام ہونے کی سچی اور حقیقی پیاس پیدا ہوتی ہے اور اس کے قلب کی گہرائی سے واقعتاً اپنے رب سے مناجات کرنے اور اپنی غفلت پر پشیمان ہو کر اس سے توبہ و استغفار کرنے کا جذبہ اُبھرتا ہے تو وہ اپنے بندے سے دور نہیں‘ قریب ہی ہوتا ہے۔ اُس کا در اُس کی طرف رجوع کرنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔ اسلام میں توبہ کا دروازہ کس درجہ کھلا رکھا گیا ہے‘ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: ((اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ))(رواہ الترمذی)’’یقیناً اللہ تعالیٰ اُس وقت تک بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک موت کا گھنگھرو نہ

بولنے لگے۔'' یعنی جب تک عالمِ نزع طاری نہ ہو جائے' توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اگرچہ کسی کے کوہِ اُحد جتنے گناہ ہوں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ نے اسی مفہوم کی یوں ترجمانی کی ہے:

بازآ' بازآ' ہر آنچہ ہستی بازآ!
کُر کافر و گبر و بُت پرستی بازآ!

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی بازآ!

''واپس آجائو' واپس آجائو! تم جو بھی ہو' واپس پلٹ آئو! تم چاہے کافر ہو' مجوسی ہو یا بت پرست ہو' واپس پلٹ آئو! ہماری یہ بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اگر سوبار توبہ توڑ چکے ہو تو بھی واپس پلٹ آئو!''

آج اگر خلوص و اخلاص کے ساتھ پھر متوجّہ ہوگے تو یہ بارگاہ وہ ہے جو کبھی بند نہیں ہوتی۔ اس پر کوئی حاجب اور دربان نہیں۔ سچی پشیمانی اور خلوص کے ساتھ رجوع کرو۔ اس ارادہ کے ساتھ اللہ سے توبہ کرو کہ مَیں شرم سار ہوں' پشیمان ہوں' تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ اے اللہ! اب تک جو زندگی غفلت میں گزری ہے' گناہوں میں بسر ہوئی ہے اسے تُو معاف فرما دے۔ اب مَیں ازسرِ نو تجھ سے عہد کر رہا ہوں' پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ' پورے عزم کے ساتھ کہ اب تیرے حکم کے خلاف نہیں چلوں گا اور تیری مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گا۔ تو نے جو کرنے کو فرمایا ہے وہ کروں گا اور جس سے بچنے کا حکم دیا ہے اس سے بچوں گا۔ تجھ پر ایمان پختہ رکھوں گا۔

ربّ اور بندے کا تعلق دو طرفہ ہے!

چنانچہ اس آیت کا اگلا حصّہ یہی ہے جو اس وقت مَیں نے عرض کیا ہے: {فَلْيَسْتَجِيبُوا لِيْ}''انہیں بھی توچاہیے کہ میرا کہنا مانیں۔''یک طرفہ معاملہ نہیں چلے گا کہ تم مجھ سے اپنی منوانا چاہو اور میری مانو نہیں۔ مجھے اپنی احتیاجیں سنانا چاہو اور میری بات سنو ہی نہیں۔ مجھ سے تم چاہو کہ مَیں تمہاری مدد کروں جبکہ تم میرے دشمنوں کی مدد کرو اور ان کے ساتھ سازباز کرو۔ تم میرے باغیوں کے ساتھ وفاداری کا رشتہ استوار کرو اور میرے نافرمانوں کے نقشِ قدم کو اپنے لیے نشانِ راہ بنائو۔ یہ نہیں ہو گا' بلکہ دو طرفہ معاملہ ہوگا: {فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ} (البقرۃ:۱۵۲)''تم مجھے یاد رکھو' مَیں تمہیں یاد رکھوں گا۔'' {اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ ۷} (محمد)''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔'' اللہ کی مدد کیا ہے؟

یہ دراصل اُس کے دین کی خدمت ہے۔ اس کے دین کی اقامت کے لیے تن من دھن لگانا ! اللہ ہم سے روزی نہیں چاہتا۔ سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے نوعِ انسان سے فرمایا گیا: { لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُکَ } (آیت ۱۳۲) ''(اے نبی ﷺ !) ہم آپ سے روزی طلب نہیں کرتے' بلکہ ہم آپ کو رزق دیتے ہیں۔''سورۃ الذاریات میں یہ اٹل بات فرما دی: {وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿ ۵۶ ﴾}''اور مَیں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اسی لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''{مَاۤ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ﴿ ۵۷ ﴾}''مَیں ان (جن و انس) سے رزق کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ اس کا خواہاں ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں' پلائیں'' {اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ﴿ ۵۸ ﴾}''تحقیق اللہ تو خود ہی رزّاق ہے (روزی رساں ہے) بڑی قوت والا ہے' بڑا زبردست ہے۔'' ہاں اُس کے دین کا جھنڈا اٹھائو۔ اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائو تو پھر جو دُعا کرو گے اسے ہم قبول کریں گے۔ تمہاری جو پکار ہو گی اس پر ہمیں موجود پائو گے۔

ایک حدیث شریف میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں: ((اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ اَمَامَکَ))(رواہ احمد)''تم اللہ کو یاد کرو تو اُسے اپنے سامنے موجود پائو گے۔'' وہ کہیں دور ہے ہی نہیں۔ سورۂ قٓ میں فرمایا : { نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿ ۱۶ ﴾ } ''ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں۔''سورۃ الحدید میں فرمایا: {هُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ} (آیت ۴) ''وہ (اللہ) تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو۔'' یہ تو تمہاری بے التفاتی اور عدم توجہی ہے کہ ہماری طرف رخ نہیں کرتے۔ تمہارے دل کے سنگھاسن پر ہماری محبّت کے بجائے کسی اور کی محبّت براجمان ہے۔ تمہارے دل پر تو حب ِجاہ' حب ِشہرت اور زر' زمین اور زن کی محبتوں نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ اگر دل کو ان محبتوں سے پاک کر کے میری محبّت سے آباد کر لو تو جہاں تم ہو' وہاں مَیں ہوں۔ حدیث قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ پھر ایک مقام وہ بھی آتا ہے کہ مَیں اپنے بندے کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا

ہے' مَیں اپنے بندے کے پائوں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے' مَیں اپنے بندے کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' مَیں اپنے بندے کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔

ربّ کی پکار پر لبیک کہو !

{اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ}(آیت ۱۸۶) ''مَیں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔'' اجابت اور استجابت کے معنی قبول کرنے کے بھی ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں آپ کو یہ آیت ملے گی: {اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَکُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمْ مِّنْ نَّکِیْرٍ ﴿ ۴۷ ﴾}''اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہو' اس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آن دھمکے جسے لوٹایا نہ جا سکے گا۔ اس دن نہ کوئی تمہارا پشت پناہ ہوگا اور نہ ہی تمہاری طرف

سے کوئی انکار کرنے والا ہوگا۔ ''اس آیت مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ استجابت کے معنی ''قبول کرنا'' ہیں۔ {اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ} ''لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر' مانو اپنے رب کے مطالبہ کو۔'' سورۃ البقرۃ کی زیر گفتگو آیت میں فرمایا: {فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ} ''ان کو بھی تو چاہیے کہ میری پکار کو سنیں' میری بات کو قبول کریں۔''

ہمارے رب کی پکار کیا ہے؟ اس کے ضمن میں تین چیزیں خاص طور پر گن لیجیے۔ پہلی پکار ہے: {اُعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ}(البقرۃ:۲۱) ''اپنے رب کی بندگی کرو۔'' ہمہ تن اللہ کے بندے بن جائو اور پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے جھک جائو' یعنی: {ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً} (البقرۃ:۲۰۸) ''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائو۔'' اسلام میں جزوی داخلہ اللہ کو قبول نہیں ہے۔ آنا ہے تو پورے آئو' ورنہ دور ہو جائو۔ ہماری کوئی احتیاج نہیں ہے' احتیاج تمہاری ہے۔

دوسری پکار یہ ہے کہ ہماری وہ امانت تمہارے پاس ہے جو ہم نے پہلے عطا کی تھی اپنے محبوب بندے محمد ﷺ کو۔ انہوںؐ نے اس امانت کا حق ادا کر دیا' اسے تم تک پہنچا دیا۔ انہوںؐ نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے گواہی لے

گئے:((اَلَا ھَلۡ بَلَّغۡتُ؟)) سوالاکھ کے مجمع نے حجۃ الوداع میں اقرار کیا: اِنَّا نَشۡھَدُ اَنَّکَ قَدۡ بَلَّغۡتَ وَ اَدَّیۡتَ وَنَصَحۡتَ! ''بے شک (حضور ﷺ) ! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق ِتبلیغ ادا فرما دیا' آپؐ نے حقِ امانت ادا فرما دیا اور آپؐ نے حقِ نصیحت ادا فرما دیا۔'' یہ گواہی لے کر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((فَلۡیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الۡغَائِبَ))۔ اب یہ ذمہ داری میرے کاندھوں سے اتر کر تمہارے کاندھوں پر آ گئی ہے' لہٰذا اب جو یہاں موجود ہیں پہنچائیں ان کو جو موجود نہیں ہیں! اس لیے کہ میری رسالت صرف تمہارے لیے نہیں ہے بلکہ پوری دنیا اور پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا}(سبا:۲۸) ''(اے نبی ﷺ !) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ لہٰذا دوسری پکار یہ ہوئی کہ توحید کی خود بھی گواہی دو اور اس کی دعوت کو عام کرو اور قرآن کے پیغام کو پوری نوعِ بشر تک پہنچائو۔

تیسری پکار یہ ہے کہ میرے دین کو قائم کرو' میرے کلمہ کو سربلند کرو۔ {وَ کَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا ﴿۱۱۱﴾}(بنی اسرائیل) اُس کی بڑائی کرو' اُس کی بڑائی قائم کرو جیسے کہ بڑائی کی جاتی اور قائم کی جاتی ہے۔ وہ نظام بالفعل قائم اور نافذ کرو جس میں

'Supreme Authority' صرف اللہ کو تسلیم کیا جائے۔ اُسی کا دین قائم اور غالب ہو جائے اور اس سے اوپر کوئی نہ رہے۔ تیسری پکار یہ ہے کہ اس کام کے لیے اپنے آپ کو لگائو' کھپائو اور اپنی صلاحیتوں کو صَرف کرو۔

یہی بات ہے جو آیت ِزیر مطالعہ میں فرمائی جا رہی ہے: {فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ} ''انہیں بھی چاہیے کہ میری پکار پر

لبیک کہیں۔'' {وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ}''اور مجھ پر ایمان رکھیں''۔یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے جو پونجی درکار ہے ' وہ ایمان ہے۔ جس شخص کو اللہ پر ایمان و یقین اور توکّل ہے اور اس کی مدد ونصرت پر بھروسا ہے وہی اللہ کی پکار پر لبیک کہہ سکے گا اور اس کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اس آیت مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر: {لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿ ۱۸۶ ﴾}''تاکہ لوگ رشد و ہدایت کی راہ پر آجائیں۔''یعنی

روزہ' اللہ کی تکبیر' اس کا شکر' اس سے تعلق' اس سے دُعا اور مناجات' یہ تمام امور وہ ہیں کہ اگر ایک بندۂ مؤمن ان کا خلوص و اخلاص کے ساتھ اہتمام کرے تو وہ رشد و ہدایت اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

یہ ہے وہ آیت مبارکہ جس کے ذریعہ سے ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ دُعا کا روزے اور رمضان کے دوگونہ پروگرام سے کیا تعلق ہے ! مَیں رمضان کو اس لیے شامل کر رہا ہوں کہ روزہ تو دن کا ہے اور رات کو درحقیقت رمضان کا خصوصی پروگرام ہے۔ رمضان کیا ہے : {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ}''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے''۔چنانچہ یہ رات کی تراویح' یہ رات کا قیام' یہ قرآن مجید کا سننا' سنانا اوراس کا سمجھنا' یہ اصل میں رمضان کا حق ہے۔ روزے تو خواہ کسی مہینے کے فرض ہو جاتے 'ان کی برکات تو وہی رہتیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دو آتشہ پروگرام بنایا کہ دن کا روزہ ہو اور رات کا قیام تاکہ دونوں کا نتیجہ یہ نکلے کہ تمہارے اندر اپنے رب کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کی پیاس اُبھرے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت اور اس کی معرفت کا ایک جذبہ دل میں جوش مارے۔ جب یہ کیفیت ہو جائے تو اے نبی ﷺ ! ان کو میری طرف سے خوشخبری دیجیے کہ مَیں قریب ہی ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے۔ پس یہ بھی میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر پختہ ایمان رکھیں تاکہ رشد و ہدایت سے ہمکنار ہوں۔

دعا اور عبادت مترادف ہیں !

اس آیت مبارکہ کی اہمیت مَیں مزید چند آیات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سورۃ المؤمن کی ایک آیت عام طور پر جمعہ میں خطبہ اوّل کے اختتام پر پڑھی جاتی ہے :

{وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿ ۶۰ ﴾}

یہ اس اعتبار سے بڑی جامع آیت ہے کہ اس میں دُعا اور عبادت کا ہم معنی اور مترادف ہونا بالکل واضح اور ظاہر و باہر ہو جاتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے دو حصے ہیں اور

ہمیں ان دونوں حصوں کے مابین ربط و تعلق کو جاننا ہو گا۔ پہلے حصے میں فرمایا:{وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ}''اور تمہارے رب نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے پکارو مَیں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔'' ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اس

لی بڑی پیاری وضاحت فرمائی ہے: ((اِنَّہٗ مَن لَمْ یَسْاَلِ اللہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ))(رواہ الترمذی) ''حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اُس سے ناراض ہو جاتا ہے''۔ دنیا میں اگر کسی سے کچھ مانگا جائے تو بالعموم انسان کو ناگوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے سخی کا حال بھی یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک سوال کیا 'اس نے پورا کردیا 'لیکن اگر سوال کا سلسلہ دراز ہوا تو ایک حد تک آکر اس کے ماتھے پر بھی بل پڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس اللہ ربّ العزت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے اور اُس سے جتنا مانگا جائے اتنا ہی وہ خوش ہوتا ہے 'اور جتنا مانگا جائے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بے حساب دیتا ہے۔ آپ اللہ سے دُعا کرتے ہیں' اس سے مانگتے ہیں تو اس لیے کہ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ وہ آپ کی دُعا سنتا ہے' آپ کی تکلیف کو رفع کر سکتا ہے' آپ کی احتیاج کو پورا کر سکتا ہے ۔ اس طرح آپ کی طرف سے اللہ کے سمیع ہونے اور اس کے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہونے کے یقین کا اقرار و اظہار ہوتا ہے۔ یہی چیزیں درحقیقت ایمان کا لبِ لباب ہیں۔

اگر ہماری شخصیتیں مسخ ہو گئی ہوں اور ہمارے اخلاقی تصوّر میں فساد پیدا ہو گیا ہو تو یہ بات دوسری ہے' ورنہ آپ سوچیے کہ اگر کوئی شریف شخص کسی سے کوئی درخواست کرے کہ میرا یہ کام کر دیجیے اور وہ اس کام کو کر دے تو کیا وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ اگر اس نے میری کوئی تکلیف رفع کی ہے یا میری کوئی ضرورت پوری کی ہے اور آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تو مجھ پر بھی اس کا کوئی حق قائم ہو گیا ہے! ہر شریف اور بامروّت انسان کا یہ ردِّ عمل لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اللہ سے دُعا کریں گے' اس کی استعانت کے طالب ہوں گے تو اگر آپ کی شخصیت مسخ نہ ہوئی ہو تو خود بخود آپ کے دل میں یہ جذبہ اُبھرے گا کہ آپ اپنے محسن کے شکر گزار بنیں۔ چنانچہ دُعا کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ آپ میں عبدیت پیدا ہو۔ آپ یہ سمجھیں کہ آپ پر اللہ کا یہ حق ہے کہ آپ اس کا ہر حکم تسلیم کریں۔

چونکہ آپ اس سے دُعا کر رہے ہیں' اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدُعا کر رہے ہیں لہٰذا اس کا معقول' فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کی بندگی اختیار کریں۔ چنانچہ آیت مبارکہ کے اس حصّہ کا دوسرے حصّہ سے نہایت گہرا ربط و تعلق قائم ہو گیا ہے۔

اس ربط کی تفہیم کے لیے ہم پوری آیت مبارکہ کا دوبارہ مطالعہ کرتے ہیں: {وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾} ''اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھے پکارو (مجھ سے دُعا کرو) مَیں تمہاری دُعائوں کو قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (یعنی تکبّر کی بنا پر میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں) یہی لوگ عنقریب جہنّم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔'' آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دُعا اور عبادت کس طرح ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دُعا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے اور مناجات کرنے کے مظہر کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ آپ اُسے حاضر و ناظر تسلیم کرتے ہیں۔ اُسے القَدِیر سمجھتے ہیں' اُسے السَّمِیع جانتے ہیں' اُسے مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں' اُسے الرَّحْمٰن الرَّحِیْم تسلیم کرتے ہیں' اُسے فریاد رس اور عادل و منصف سمجھتے ہیں۔ علّامہ اقبال کے تیسرے لیکچر کا عنوان ہے:

''The Conception of God and the Meaning of Prayer''

ان کے لیکچرز کی زبان خاصی مشکل ہے لیکن یہ لیکچر نسبتاً آسان ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''دُعا کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہماری انائے صغیر اُس انائے کبیر کے روبرو ہو جائے' ہم اللہ سے خطاب کر رہے ہوں۔'' ایک ہے غائبانہ ذکر یا passive ذکر' جیسے ہم سبحان اللہ' الحمد للہ اور اللہ اکبر کا ورد کرتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے لیکن اس میں اس سے خطاب نہیں ہے۔ اس میں مکالمہ اور مخاطبہ والی بات نہیں ہے۔ البتہ جب آپ کہتے ہیں: {اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴿۴﴾} ''اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ سے

ہی مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے'' تو اس میں اللہ سے خطاب ہے۔ یہاں ہماری انائے صغیر (finite ego) روبرو آجاتی ہے انائے کبیر (Infinite Ego) کے۔ یہ جو بالمشافہہ بات ہو رہی ہے' یہ درحقیقت فکر کی معراج (climax) ہے۔ یہ active ذکر ہے۔ اس میں اللہ کو مخاطب کر کے اس کو یاد کیا جارہا ہے۔

اللہ سے کیا مانگا جائے؟

دُعا کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے رب سے کن چیزوں کی دُعا کرنی چاہیے۔ اختصار سے عرض کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں ایک طرف تو نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہاں تک تلقین فرمائی ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی درکار ہو تو اللہ سے مانگو۔ یعنی یہ کہ حقیر سے حقیر شے بھی اللہ ہی سے مانگو اور بڑی سے بڑی شے بھی اُسی سے مانگو۔ اس طرح گویا تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ کسی اور سے کچھ نہ مانگو۔ تمہارے لیے اتنی بڑی بارگاہ کھلی ہوئی ہے' یہاں سے کیوں نہیں مانگتے؟ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے مابین ہیں۔ وہ تمہاری ضرورت جس کے ذریعے سے چاہے گا' پوری کر دے گا۔ تم کیوں اپنے جیسے انسان کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اپنی انسانیت کو رسوا کرتے ہو؟ آپ نے کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلایا تو گویا اپنی عزّتِ نفس کا دھیلا کر دیا۔ لہٰذا جو کچھ بھی مانگنا ہو' اللہ سے مانگو۔ کوئی چیز اس کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں ہے۔

سورۃ الکہف میں دو یتیم بچوں کے مکان کی دیوار کا ذکر آیا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے گر رہی تھی۔ ان کے والدین نیکوکار تھے۔ انہوں نے کچھ پونجی اپنے یتیم بچوں کے لیے اس دیوار کے نیچے گاڑی ہوئی تھی تاکہ بچے جب بڑے ہو جائیں تو ان کے کام آئے۔ وہ دیوار گرا چاہتی تھی کہ اس کو بچانے کے لیے حضرت خضر پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ کے نظام میں اللہ کے احکام کی تنفیذ کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے محافظت کرنے والے نہ معلوم کہاں کہاں موجود ہیں' ہم تو جانتے تک نہیں۔ {وَمَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّکَ اِلَّا ہُوَ ؕ} (المدثر:۳۱)''تمہارے رب کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا سوائے اُس کے۔''وہ جس کے ذریعے سے چاہے گا 'تمہاری ضرورت کو پورا کرا دے گا۔ لہٰذا کسی سے کچھ نہ مانگو اور

جو کچھ مانگنا ہے اُسی سے مانگو۔

جیسے معرفت اور ہدایت کے مختلف درجے ہیں :{لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿ ۱۹ ﴾ } (الانشقاق)''البتہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی۔'' یہ تو ایک ایسا مسلسل عمل ہے کہ آپ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج مجھے کُل ہدایت حاصل ہو گئی' اسی طرح دُعا کے بھی درجات ہیں۔ دُعا کے ضمن میں بلند ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ سے کچھ نہ مانگو سوائے ہدایت اور استقامت کے ۔ دُنیا کی کوئی شے اللہ سے نہ مانگو'اس لیے کہ تمہیں کیا پتہ کہ جو کچھ تم اللہ سے مانگ رہے ہو' وہ حقیقت میں تمہارے لیے خیر ہے یا شر ہے ۔ وہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {وَ عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَ عَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿ ۲۱۶ ﴾ ٪} (البقرۃ)یعنی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور تم اللہ سے اسے اپنے سے دور کر دینے کی دُعا کرو 'حالانکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور اس کے حصول کے لیے اللہ کے حضور گڑگڑا کر اور ماتھا رگڑ کر دُعا کرتے رہو اور حقیقت میں وہی چیز تمہارے لیے موجب ِشر ہو۔ اللہ جانتا ہے ' تم نہیں جانتے۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:{وَ یَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَہٗ بِالۡخَیۡرِ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ﴿ ۱۱ ﴾ }''اور انسان خیر مانگتے مانگتے اپنے لیے شر مانگ بیٹھتا ہے' چونکہ انسان جلد باز ہے۔''انسان حقیقت کو نہیں دیکھتا جبکہ اللہ تعالیٰ حقیقت کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا اس سے مانگنے کی اصل چیز ہے ہدایت۔اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ''اے اللہ' اے ہمارے رب ! ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرما۔''

((اَللّٰھُمَّ اھۡدِنَا فِیۡمَنۡ ھَدَیۡتَ ' وَعَافِنَا فِیۡمَنۡ عَافَیۡتَ ' وَتَوَلَّنَا فِیۡمَنۡ تَوَلَّیۡتَ ' وَبَارِکۡ لَنَا فِیۡمَا اَعۡطَیۡتَ ' وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَیۡتَ ' فَاِنَّکَ تَقۡضِیۡ وَلَا یُقۡضٰی عَلَیۡکَ ' اِنَّہٗ لَا یَذِلُّ مَنۡ وَّالَیۡتَ ' وَلَا یَعِزُّ مَنۡ عَادَیۡتَ 'تَبَارَکۡتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیۡتَ ' نَسۡتَغۡفِرُکَ وَنَتُوۡبُ اِلَیۡکَ)) (۱)

_____(۱) حدیث میں آتا ہے کہ یہ دُعا نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو صلوٰۃ الوتر میں پڑھنے کی خاص طور پر تلقین فرمائی تھی۔ (بحوالہ ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ)

''اے اللہ ! تُو ہماری رہبری فرما ان لوگوں میں جن کی تُو نے رہبری کی ہے' اور ہمیں عافیت دے ان لوگوں میں جن کو تُو نے عافیت دی ہے' اور ہمیں دوست بنا لے ان لوگوں میں جن کو تُو نے دوست بنا لیا ہے' اور ہمیں برکت دے اس چیز میں جو تُو نے ہمیں عطا کی ہے 'اور ہمیں ہر اُس برائی سے بچا لے جو تُو نے مقدّر کر رکھی ہے' کیونکہ تُو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کا تُو دوست بن جائے وہ ذلیل نہیں ہو سکتا اور جس سے تُو دشمنی کرے وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے رب ! تُو برکت والا ہے اور بلند و برتر ہے۔ ہم تجھ سے مغفرت چاہتے ہیں اور ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔''

پھر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کی جائے:

((اَللّٰھُمَّ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ' وَیَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ))

''اے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے والے ! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر جمائے رکھنا۔ اور اے دلوں کو پھیرنے والے ! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔'' (آمین !)

پھر اللہ ربّ العزت سے ہدایت میں افزونی اور علم میں اضافہ کی دُعا کیجیے۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ سے فرماتا ہے : {وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾} ''اور (اے نبی ﷺ !) کہا کیجیے کہ اے میرے رب' میرے علم میں اضافہ فرما !'' اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دُعا کیجیے۔ نماز میں سلام پھیرنے کے بعد حضور ﷺ جو دُعائیں مانگا کرتے تھے ' اس میں یہ دُعا بھی ہوتی تھی: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّرِزْقًا طَیِّبًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا)) ''اے اللہ ! مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں نفع دینے والے علم اور پاک اور حلال روزی اور مقبول ہونے والے عمل کا۔''

اور اللہ سے مانگنے کی چیز ہے فہم و فراست۔ جیسے روایات میں ایک دُعا منقول ہے : ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ فی الواقع وہ ہیں۔'' ظاہر تو سب ہی دیکھ رہے ہیں لیکن مجھے ہر شے کی اصل حقیقت پر مطلع فرما ! اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا !

تو اللہ سے وہ نظر مانگیے جو اشیاء کی حقیقت تک پہنچے۔ اس دُعا کو حرزِ جان بنایئے :

{رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ہَدَیۡتَنَا وَ ہَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَہَّابُ ﴿۸﴾} (آل عمران)

''اے رب ہمارے ! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا مت کردینا اس کے بعد کہ تُو ہمیں ہدایت دے چکا اور ہم کو اپنے خاص خزانۂ فضل سے رحمت عنایت فرما۔ بے شک تُو ہی ہے سب کچھ دینے والا۔''

اب ایک راز کی بات سمجھ لیجیے۔ انسان معرفتِ الٰہی میں جتنا بڑھتا چلا جائے گا ' اتنا ہی اس کی دُعا کا دائرہ محدود ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنی طلب کو ایک نکتے پر مرکوز کرتا چلا جائے گا۔ یعنی یہ کہ اللہ سے کیا دولت مانگے' کیا اولاد مانگے' کیا دنیا کی کوئی چیز مانگے ! ہمیں کیا پتہ کہ وہ ہمارے حق میں خیر ہے یا شر !

دُعا کے باب میں اوّلیت پر تو وہ دُعا رہ جائے گی جس کا نام دُعائے استخارہ ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کہنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہ دُعا ایسے سکھائی اور تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے اور تلقین فرماتے تھے۔ وہ دُعا یہ ہے :

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ ، فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا لْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْہُ لِیْ وَیَسِّرْہُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْہِ ، وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْہُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْہُ ، وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِہٖ)) (رواہ البخاری)

''اے اللہ ! مَیں تیرے علم کے ذریعہ سے بھلائی مانگتا ہوں اور تیری قدرت کے ذریعہ سے قدرت چاہتا ہوں۔ اور مانگتا ہوں تیرے فضل عظیم سے۔ کیونکہ

بالیقین تُو ہی قادر ہے ‘مَیں قادر نہیں ہوں اور تُو ہی جانتا ہے ‘ مَیں نہیں جانتا۔ اور تُو ہی علّام الغیوب ہے۔ اے میرے اللہ ! اگر تُو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین‘ میری معاش اور انجام کار کے اعتبار سے میرے لیے اچھا ہے تو اسے تُو میرے قابو میں کر دے اور اس کو میرے لیے آسان بنا دے‘ پھر اس میں میرے لیے برکت عطا فرما۔ اور اگر تیرے علم کامل میں یہ کام میرے لیے دین و دنیا اور انجام کار کے اعتبار سے شر ہے تو اس کام کو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے‘ اور میرے لیے بھلائی مقرر فرما دے جہاں کہیں بھی وہ ہو‘ اور پھر مجھے اس پر راضی فرما دے۔‘‘

ہدایت اور معرفت کی طرح دُعا کے بھی درجے ہیں۔ چنانچہ اصولی بات تو یہ ہو گی کہ اگر مانگنا ہی ہے تو اللہ سے مانگو‘ یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ تک اسی سے مانگو۔ البتہ اللہ سے مانگنے کی اعلیٰ و ارفع چیزیں دوسری ہیں۔ توپ سے مکھیاں نہیں مارا کرتے۔ دُعا ایک بہت بڑی توپ ہے۔ اس سے بڑی شے کا شکار کرو‘ اس کے ذریعے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگ رہے ہو ! دنیا کی حقیر چیزیں مانگ کر تم نے دُعا جیسی مؤثر شے ان پر صَرف کر دی۔ دُعا تو اعلیٰ و ارفع چیزوں کے لیے ہونی چاہیے۔ وہ ہدایت کے لیے ہو‘ دین کے علم اور اس کے فہم کے لیے ہو اور دین پر عمل پیرا ہونے اور اس پر استقامت و ثبات کے لیے ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے یہ توفیق طلب کرنی چاہیے کہ اپنا تن من دھن اس کے دین کی سرفرازی و سربلندی کے لیے لگا دیا جائے۔ اس سے اس کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی ہمت طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ سے شہادت کی موت مانگیے‘ اس لیے کہ خود حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ آرزو کی ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍبِیَدِہٖ‘ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُغْزٰوفِیْ سَبِیْلِ اللہِ فَاُقْتَلُ‘ ثُمَّ اُغْزٰوفَاُقْتَلُ‘ ثُمَّ اُغْزٰوفَاُقْتَلُ)) (متفق علیہ)

’’اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے ! میری یہ تمنّا اور خواہش ہے کہ مَیں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں‘ پھر (مجھے زندہ کیا جائے اور) مَیں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں‘ (پھر مجھے زندہ کیا جائے اور)

میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں !‘‘

حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ملاحظہ کیجیے:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِّنْ نِفَاقٍ)) (رواہ مسلم)

’’جو (مسلمان) اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی تمنا ہی پیدا ہوئی‘ اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ پر ہوئی۔‘‘

چنانچہ اللہ سے مانگنے کی چیزیں جذبۂ جہاد اور شوق شہادت ہیں۔ (۲)

''دعا ہی اصل عبادت ہے!''

گفتگو سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ پر چل رہی تھی جس سے واضح ہوتا ہے کہ دُعا اور عبادت ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں۔ اب سورۂ مریم کی چند آیات ملاحظہ کیجیے۔ ان میں بھی دُعا اور عبادت کو ہم معنی اور مترادف کے طور پر لایا گیا ہے۔ گویا دُعا اور عبادت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو دعوتِ توحید دی جو اپنے ملک کے مشرکانہ نظامِ حکومت میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے' خود بت تراش بھی تھے اور سب سے بڑے مندر کے پروہت بھی' تو باپ نے نہایت سختی سے انہیں جھڑک دیا اور حکم دیا کہ فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ' ورنہ میں تم کو سنگسار کر دوں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور اس موقع پر آنجنابؑ نے جو الوداعی کلمات کہے' ان کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

_____(۲) صحیح بخاری میں منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ طلب شہادت کے لیے کثرت سے یہ دُعا مانگا کرتے تھے جو قبول بھی ہوئی اور آپؓ مدینۃ النبی ﷺ میں ایک مجوسی غلام کے ہاتھوں شہید ہوئے: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ ﷺ ''اے اللہ! تُو مجھے اپنے راستہ میں شہادت کی موت عطا فرما اور میری موت تیرے رسول ﷺ کے شہر میں واقع ہو''۔ (مرتّب)

{قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْکَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿ ۴۷ ﴾ وَ اَعْتَزِلُکُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ اَدْعُوْا رَبِّیْ ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ﴿ ۴۸ ﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَھُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۙ وَھَبْنَا لَہٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ وَ کُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ﴿ ۴۹ ﴾ وَ وَھَبْنَا لَھُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَھُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ﴿ ۵۰ ﴾ }

''(باپ کی جھڑکی اور اظہارِ غیظ و غضب کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:) اچھا تو آپ کو میرا سلام! (مَیں الگ ہو جاتا ہوں' پھر بھی) مَیں اپنے رب سے آپ کی مغفرت کی دُعا کروں گا' بے شک وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ مَیں آپ لوگوں سے بھی کنارہ کرتا ہوں اور ان (ہستیوں) سے بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں' مَیں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا' اُمید ہے کہ مَیں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔ پھر جب ابراہیم ؑ ان لوگوں سے اور ان (بتوں) سے جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے کنارہ کش ہو گیا تو ہم نے اسے اسحٰق اور (اسحٰق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا' اور ہر ایک کو نبی بنایا۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی۔''

ان آیات سے بھی یہ بات مزید مؤکد ہو گئی کہ دُعا اور عبادت ہم معنی ہیں۔ جس کو تم نے واقعتاً اپنا معبود مانا ہے' اسی سے دُعا کرو گے' اسی کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارو گے' اسی سے فریاد کرو گے اور اسی

لی دہائی دو گے۔

مَیں نے اس موقع پر سورۃ المؤمن کی ایک' اور سورۂ مریم کی چار آیات کے حوالے سے دُعا اور عبادت کا جو ربط و تعلق بیان کیا ہے' بعینہٖ یہی نقشہ ہے سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت کا۔ سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں ہیں' پہلی تین میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تمجید ہے۔

{اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴿ ۱ ﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ﴿ ۲ ﴾ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ﴿ ۳ ﴾ }

چوتھی آیت مرکزی آیت ہے:{اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ؕ﴿ ۴ ﴾ } ''(اے رب !) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''۔ (۳)

---

(۳) عربی زبان میں فعل مضارع بیزمانہ حال اورزمانہ مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں۔(مرتّب)

استعانت کے معنی ہیں مدد مانگنا۔ استعانت' استدعا' استمداد' استنصار اور استغاثہ عربی مبین کے ایسے الفاظ ہیں جن سب میں مدد مانگنے کا مفہوم مشترک ہے اور یہ دُعا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت صرف اللہ کے لیے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت میں دو چیزیں عبادت و استعانت بالکل یک جان ہو گئیں۔ {اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ؕ﴿ ۴ ﴾ }

احادیثِ نبوی ؐ حکمتِ قرآنی کا عظیم ترین خزانہ ہے۔ قرآن حکیم کا لب لباب اور جوہر رسول اللہ ﷺ کے چھوٹے چھوٹے ارشادات اور فرمودات میں مل جائے گا' بالکل سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق۔ آپ ﷺ نے فرمایا :((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ))(۴) ''دُعا عبادت کا مغز ہے۔'' لفظ ''مُخّ'' میں مغز کے علاوہ گودا' جوہر اور لب لباب کے مفاہیم بھی موجود ہیں۔ دوسری حدیث میں تو یہ پردہ بھی اٹھا دیا گیا' ارشاد فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ))(۵) ''دُعا ہی اصل عبادت ہے۔'' جس سے تم دُعا کر رہے ہو وہی تمہارا معبود ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو پکارا ہے تو وہی آپ کا معبود ہے' چاہے آپ زبان سے کہہ رہے ہوں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں مانتے ! لیکن اگر آپ نے کہا ''یا علی مدد'' تو آپ نے علی ؓ کو اپنا معبود بنا لیا۔ آپ حضرت علی ؓ کی پرستش اور بندگی کر رہے ہیں' چاہے آپ اس کا اقرار کریں' چاہے نہ کریں۔ توحید کا تقاضا یہی ہے کہ استدعا' استعانت' استمداد' استنصار' استغاثہ صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی دُعائوں کو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بابرکات کے لیے خالص کر لیں۔

دعا کی قبولیت کے مختلف انداز

دُعا کے ضمن میں ایک عملی بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق کوئی دُعا کبھی بیکار یا رائیگاں نہیں جاتی۔ دُعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے لیکن اس کی مقبولیت کی تین

(۴) سنن الترمذی، عن انس بن مالک رضي الله عنه

(۵) سنن الترمذی، عن النعمان بن بشير رضي الله عنه

مختلف شکلیں ہیں۔ پہلی یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگتا ہے وہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں اس کے لیے خیر ہے تو وہ اسے وہی چیز عطا فرما دیتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اللہ کے علم کامل میں یہ ہے کہ میرا بندہ لاعلمی میں مجھ سے ایسی چیز مانگ رہا ہے جو اس کے حق میں مفید نہیں ہے، جیسے آپ کا بچہ آپ سے چاقو مانگے تو آپ اسے چاقو نہیں دیتے، اسی طرح اگر اللہ کے علم کے مطابق یہ چیز اس بندے کے حق میں مفید نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں بندے کو وہ چیز عطا فرما دیتا ہے جو اس کے حق میں واقعتاً مفید ہو۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی شے بھی بندے کو دینا اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ میں نہیں تو اللہ تعالیٰ اس دُعا کو بندے کے لیے توشہ آخرت بنا لیتا ہے۔ آخرت میں وہ دُعا اس بندے کے لیے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جائے گی۔

اقول قول هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

روحِ اعتکاف اور

عظمتِ لیلۃ القدر

ناظم آباد، کراچی کی ایک جامع مسجد میں

رمضان المبارک کا تیسرا خطابِ جمعہ

(بتاریخ:۲۰رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ /۳۰مئی۱۹۸۶ء)

قرآن حکیم میں روزے اور اُس کے متعلقات کا ذکر

قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کا ۲۳واں رکوع اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں روزے سے متعلق تمام مضامین یکجا ہو کر آگئے ہیں۔ چنانچہ چھ آیات پر مشتمل اس رکوع میں جہاں روزے کا حکم‘ اس کی حکمت اور اس کے تفصیلی احکام بیان ہوئے ہیں وہاں روزے کی عبادت کے لیے خصوصی طور پر ماہِ رمضان کے انتخاب کی حکمت‘ روزے کا دعا اور رزقِ حلال سے ربط و تعلق بھی واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں رمضان المبارک کی خصوصی عبادت ’’اعتکاف‘‘ کا ذکر اس رکوع کی پانچویں آیت میں وارد ہوا ہے جس میں رمضان اور روزے کے معاملات زیر بحث آئے ہیں۔ فرمایا گیا: {اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ

يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾}

''حلال کیا گیا ہے تمہارے لیے روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے' وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو اُن کی۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے' سو اُس نے تم پر نظر رحمت فرمائی اور تمہیں معاف کردیا۔ پس اب تم ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو اُس کو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے (یعنی اولاد)۔ اور کھائو اور پیو جب تک کہ صاف جدا نظر آئے تم کو صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے' پھر پورا کرو روزے کو رات تک۔ اور مباشرت نہ کرو عورتوں سے جب کہ تم حالتِ اعتکاف میں ہو مسجدوں میں۔یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں' سو ان کے نزدیک نہ جائو۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کرسکیں۔''

اس رکوع کی تیسری آیت {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ .....الخ} کے مطابق اس ماہِ مبارک کی عظمت کی اساس یہ ہے کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے اور اس کا پروگرام دوگونہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اس میں ایک تو فرض ہے یعنی دن کا روزہ اور ایک کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اگرچہ فرض تو قرار نہیں دیا' البتہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ترغیب و تشویق کے ذریعہ سے اس کی طرف اُمّت کو توجّہ دلائی ہے اور اس کا خصوصی اہتمام کرنے کی تاکید فرمائی ہے یعنی قیام اللیل کا پروگرام۔ رات کو اپنے ربّ کے حضور دست بستہ کھڑے ہو کر اُس کے کلام کو سننا۔ اس کی ایک معیّن مقدار بیس رکعات صلوٰۃ التراویح کی شکل میں اگرچہ حضور ﷺ سے ثابت نہیں ہے لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشورے سے یہ نظام مقرر کیا جو تواتر کے ساتھ اُمّت میں چلا آرہا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر لوگ ساری رات نہ جاگ سکیں تو عربی کے ایک محاورے ''مَا لَا یُدرَکُ کُلُّہٗ لا یُتْرَکُ کُلُّہٗ'' کے مصداق نمازِ عشاء کے بعد کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو قرآن کے ساتھ جا گیں۔ لیکن فی الواقع مطلوب یہی ہے کہ تمام رات اسی کیفیت میں بسر ہو' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی الله عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ..... وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ..... وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ)) (رواہ البخاری و مسلم)

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے اس کے پچھلے گناہ بخش دیے گئے..... اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے اس کی بھی پچھلی خطائیں بخش دی گئیں..... اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا(قرآن پڑھنے یا سننے کے لیے) ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔''

اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ' فَیُشَفَّعَانِ))(رواہ احمد والطبرانی والبیھقی ' صححہ الالبانی فی صحیح الجامع)

''روزہ اور قرآن قیامت کے روز بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا : اے ربّ' مَیں نے اس شخص کو دن کے وقت کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا پس تُو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ اور قرآن یہ کہے گا کہ اے پروردگار! مَیں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکے رکھا لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ (حضور ﷺ بشارت دیتے ہیں کہ) پھر دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول کی جائے گی۔''

اب آپ غور کیجیے کہ جیسے روزے کی بندش صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کی ہے' دو چار گھنٹے کی نہیں ہے' ویسے ہی مطلوب یہ ہے کہ رمضان المبارک کی پوری رات اس عالَم میں بسر ہو کہ قرآن مجید کے ساتھ ہر مسلمان کا ازسرِنو ایک ذہنی و قلبی ربط و تعلق قائم ہو جائے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن حکیم کی عظمت منکشف ہو گی اور قرآن کو

پڑھنے' سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا عزم دل میں پروان چڑھے گا۔ اس کے بعد اس رکوع کی چوتھی آیت میں روزہ اور دعا کا ربط و تعلق ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :{وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿ ۱۸۶ ﴾}

''(اے نبی ﷺ !) میرے بندے جب آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ مَیں قریب ہی ہوں۔ مَیں ہر دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں (قبول کرتا ہوں) جب وہ مجھے پکارتا ہے' البتہ انہیں بھی چاہیے کہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ راہ یاب ہو سکیں۔''

یعنی کامیابی اور کامرانی اسی راستہ سے حاصل ہو گی کہ وہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ محض دعائیں مانگنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یعنی اس کا دوسرا رخ کیا ہے ! یہ کہ تم میری باتیں مانو' تو مَیں تمہاری مانوں گا' جیسے قرآن میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا: {فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ}(البقرۃ:۱۵۲)یعنی ''تم مجھے یاد رکھو مَیں تمہیں یاد کروں گا''۔ اور{اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ} (محمد:۷)یعنی ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔''

مَیں چاہوں گا کہ اس بات کو مزید واضح کروں کہ اللہ کی وہ پکار کیا ہے ! جو حضرات میرے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کر رہے ہیں ان کے سامنے اللہ کی یہ پکار بار بار آ رہی ہے۔ اس کی پہلی پکار یہ ہے کہ خود میرے مخلص بندے بن جائو اور میرے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرلو: {فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ۲ } (الزمر)۔ دوسری پکار یہ ہے کہ میری دعوت کو عام کرو: {اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ } (النحل:۱۲۵)''بلائو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت اور وعظ کے ساتھ اور ان (منکرین) کے ساتھ مجادلہ کرو اور اس طریق پر جو بہترین ہو''۔اس کی تیسری پکار یہ ہے کہ{اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ} (الشوریٰ:۱۳)''میرے دین کو قائم کرو''۔ مَیںنے دین اس لیے تو نہیں دیا کہ صرف اس کی مدح کرتے رہو' محض Lip service کرتے رہو۔ مَیں نے قرآن اس لیے تو

نہیں اُتارا کہ صرف اس کی تلاوت کر لیا کرو۔ قرآن تو اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ساتھ ہی تمہیں نظامِ عدل و قسط عطا فرمایا ہے تاکہ تم اس کو قائم کرو' نافذ کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے ہو تو تم مجرم گردانے جائو گے کہ {لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ} (الصف:۲) ''کیوں وہ کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو !''

خود احتسابی کی ضرورت

اگر آپ جائزہ لینا چاہیں کہ رمضان المبارک کی برکات سے آپ کو بھی کوئی حصہ ملا ہے یا نہیں ملا تو اس اعتبار سے اپنا جائزہ لیجیے اور ''self assessment'' کیجیے' جیسے انکم ٹیکس میں آج کل یہ طریقہ رائج ہے' جائزہ لیجیے کہ کیا واقعی اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کا کوئی جذبہ اُبھرا ہے ؟ واقعی دل میں یہ عزم اور ارادہ پیدا ہوا ہے کہ اللہ کے احکام پر ہمہ تن کاربند رہوں گا' اس کا کوئی حکم نہیں ٹالوں گا' اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا ! اللہ کا دین تو

ہمارے پاس ایک امانت ہے اور ہمارے کاندھوں پر اس کی ذمہ داری ہے کہ ہم اسے دوسروں تک پہنچائیں ' اس کی تبلیغ کریں' اس کی دعوت دیں اور اس کے غلبہ کی جدّوجُہد کریں۔ کیا واقعی یہ جذبہ ابھرا ہے کہ ہم تن من دھن لگا دیں گے' گردنیں کٹوا دیں گے لیکن اللہ کے دین کو غالب کریں گے ! اگر یہ ہوا ہے تو مبارک ہے۔ پھر تو آپ نے رمضان المبارک سے صحیح استفادہ کیا ہے۔ اور اگر نہیں ہوا تو ...بُرا نہ مانیے گا ...نیکیاں کمانے اور تقویٰ حاصل کرنے کا موسم بہار آیا اور چلا گیا 'اس سے آپ نے کوئی استفادہ نہیں کیا' ایک رسم ہے جو ادا کر لی گئی' فاقے ہیں جو کر لیے گئے ہیں' حقیقت میں یہ روزے نہیں ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ایک فرمان سن لیجیے : ((رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صِیَامِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ)) (رواہ ابن ماجہ والنسائی)یعنی ''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس شعر کا مصداق بن رہے ہوں ؎

اس آرزو کے باغ میں آیا نہ کوئی پھول
اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے !

تو یہ بہار کے دن نکلے جا رہے ہیں۔ اب اس ماہِ مبارک کا آخری عشرہ رہ گیا ہے۔ اللہ توفیق دے تو اب بھی موقع ہے کہ ان دس دنوں سے بھرپور استفادہ کریں اور آگ سے بچنے کا سامان کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے شعبان کے آخری دن جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے آخر میں یہی الفاظ آتے ہیں: ((وَھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَآخِرُہٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ))(رواہ البیھقی)یعنی اس ماہِ رمضان کے تین عشرے ہیں: پہلا رحمت ہے' دوسرا مغفرت ہے اور تیسرا جہنم سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔ گویا یہ آخری عشرہ گردنوں کو آگ سے چھڑا لینے کا بہترین موقع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عشرے کی برکات سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

عباداتِ رمضان کا نقطۂ عروج : اعتکاف

اس آخری عشرے میں ایک خاص عبادت ہے' جسے یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ رمضان المبارک کے پورے پروگرام کا نقطہ عروج ہے۔ جس طرح ہر چیز تدریجاً ترقی کرتی ہے اور ایک نقطۂ عروج و کمال کو پہنچ جاتی ہے' اسی طرح رمضان المبارک کے پروگرام کا بھی ایک عروج ہے اور وہ عروج ہے ''اعتکاف''۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب پھر اعتکاف کا چرچا اور اس کا شوق بڑھ رہا ہے۔ نوجوان بھی بڑی تعداد میں اس مسنون عبادت کو بڑے ذوق و شوق سے ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر اس اعتکاف کی اصل حقیقت نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو نہ اس کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ اس سے صحیح طور پر استفادہ ممکن ہوتا ہے۔ اچھی طرح جان لیجیے کہ اعتکاف درحقیقت

ارتکازِ توجّہ کا نام ہے۔ کسی حقیقت پر توجّہ کو مرتکز کرنا‘ یہ ہے اعتکاف کا اصل حاصل۔

قرآن میں اعتکاف کا ذکر

قرآن مجید میں اعتکاف کا ذکر یا تو سورۃ البقرۃ کے ۲۳ویں رکوع کی پانچویں آیت (البقرۃ:۱۸۷) میں آیا ہے جس میں رمضان اورروزے کے معاملات زیر بحث آئے ہیں:{وَ لَاتُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ}یا پھر سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع میں اس کا ذکر موجود ہے کہ ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے عہد لیا

تھا کہ تم ہمارے اس گھر (بیت اللہ) کو طواف کرنےوالوں‘ اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا: { وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿ ۱۲۵ ﴾ } مزید برآں سورۃ الحج میں بھی یہ لفظ قریباً اسی سیاق و سباق میں وارد ہوا ہے۔اس کے علاوہ یہ لفظ قرآن حکیم میں کثرت سے بت پرستوں کے لیے آیا ہے۔ میں ابھی اس کی وضاحت کروں گا۔

سورۃ الاعراف (آیت۱۳۸) میں فرمایا:{وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ} یعنی ’’اور پار اُتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو تو پہنچے ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے‘‘۔پھر سورۃ الانبیاء میں ایک مرتبہ اور سورۂ طٰہٰ میں دو مرتبہ یہ لفظ بت پرستوں کے لیے استعمال ہوا۔مزیدیہ کہ سورۃ الشعراءمیں یہ مضمون بایں الفاظ آیا:{قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿ ۷۱ ﴾} یعنی ’’ان کافروں نے (حضرت ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کہ ہم ان مورتیوں کو پوجتے ہیں‘ پھر دن بھر انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں‘‘۔ بت پرستوں کا یہ اعتکاف کیا ہے؟ہندی کے دو الفاظ آپ میں سے اکثر حضرات نے سن رکھے ہوں گے : گیان اور دھیان۔ ’’گیان‘‘ کہتے ہیں معرفت کو اور ’’دھیان‘‘ ہےتوجّہ کا ارتکاز‘ یعنی جسے بھی اپنا معبود مانا ہے اس سے لولگانا۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اس حیاتِ دُنیوی میں کسی عقیدے کو ذہناً قبول تو کر لیتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے‘ لیکن اس کی طرف اس کی کامل توجّہ نہیں رہتی۔پیٹ کا دھندا‘ بال بچوں کی پرورش اور تعلیم کی فکر اور بہت سے ذاتی‘ اور گھریلو مسائل اسے گھیرے رکھتے ہیں۔ نتیجتاً زندگی کے اصل حقائق اس کے سامنے نہیں رہتے۔ اقبال کے اس خوبصورت شعر میں انسان کی اسی گمشدگی کا بیان ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق !

کیفیت گویا ع ''بازار سے گزرا ہوں' خریدار نہیں ہوں'' والی ہوتی ہے۔ مؤمن کی اصل دلچسپیاں اس دُنیا سے وابستہ نہیں ہوتیں' اس کا دل کہیں اور اٹکا ہوتا ہے۔ جیسے ایک حدیث میں الفاظ آئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ حشر کے میدان میں خاص اپنے عرشِ عظیم کے نیچے پناہ دے گا' اُس حال میں کہ اُس دن کہیں اور سایہ نہیں ہو گا: ((سَبْعَۃٌ یُظِلُّھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّہٖ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّہٗ)) ان سات میں سے ایک کی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی: ((وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ)) (صحیح ابن حبان) یعنی ''وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا رہتا ہے''۔ مسجد سے نکلتا تو ہے' ضروریاتِ زندگی کے لیے کاروبارِ دنیا میں حصّہ بھی لیتا ہے لیکن اس میں اُسے دلی انہماک حاصل نہیں ہوتا' گویا وہ اپنا دل مسجد ہی میں چھوڑ جاتا ہے۔ مجبوراً باہر نکلتا ہے لیکن گوش برصدائے اذان رہتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی کانوں میں اذان کی آواز پڑی' دھندا بند کیا' اسے چھوڑا اور مسجد کی طرف لپکا۔ لیکن ہماری کیفیت تو یہ ہے کہ دل تو دنیا سے لگا ہوا ہے اور ہماری پوری کی پوری توجّہ دنیا اور اس کے جھمیلوں میں بھی الجھی رہتی ہے۔

اعتکاف کا اصل مقصود

رمضان کے پروگرام کی معراج یہ ہے کہ انسان آخری عشرے میں دنیا سے کٹ جائے۔ پہلے دو عشروں میں تم نے دن کا کھانا پینا چھوڑا' بھوک اور پیاس برداشت کی' رات کا زیادہ حصّہ قرآن' نوافل اور ذکر و اذکار کے ساتھ جاگتے رہے' اب اس کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ آخری عشرے میں دنیا سے کٹ جاؤ۔ دس دن کے لیے اللہ کی چوکھٹ پر آکر بیٹھ جاؤ۔ دن میں روزہ رکھو اور رات کے زیادہ سے زیادہ حصّہ میں اللہ کی یاد میں اپنے آپ کو گم کر دو' تاکہ انسان کا جو معمول بن جاتا ہے' وہ ٹوٹے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان اپنے روز مرہ کے معمولات کا غیر شعوری طور پر بھی اسی طرح عادی ہو جاتا ہے کہ ایک روٹین بن جاتی ہے' اس کا ایک چکر آپ سے آپ چلتا رہتا ہے۔ اس روٹین کو دس روز کے لیے توڑو اور آؤ اللہ کے گھر میں آکر بیٹھو' اُس سے لو لگاؤ۔ یہ ہے دراصل اعتکاف کا مقصود! اصل محرومی یہ ہے کہ جو حضرات ہر سال مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں ان کی

اکثریت اس کی روح سے واقف نہیں ہے۔ اعتکاف کے لیے مسجد میں مقیم ہیں' لیکن گپیں ہو رہی ہیں' دنیوی گفتگوئیں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ باتیں اگرچہ حرام نہیں ہیں کہ کوئی آپ سے ملنے آئے اور اگر ضرورت ہو تو آپ سے کوئی

مشورہ بھی کر لے۔ لیکن ایک ہے کسی چیز کا جائز ہونا اور ایک ہے اس کی اصل روح۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اس اعتکاف کی اصل روح یہ ہے کہ ان دس دنوں کے لیے انسان اپنے آپ کو دنیا کے جھمیلوں سے منقطع کر لے۔ انسان پر اس دنیا کے مسائل کا جو غلبہ رہتا ہے اس سے اپنے آپ کو آزاد کرے۔ اپنی توجّہات کا رخ دنیا سے ہٹا کر اپنے مالک کی طرف موڑ لے۔ اگر اعتکاف میں بھی اہل و عیال' مال و منال اور کاروبار کی فکر ذہن و قلب پر مسلط رہے اور یہاں بیٹھ کر بھی تمام معاملات کے لیے ہدایات جاری ہوتی رہیں' تو خود سوچیے کہ مسجد میں معتکف ہونے کا کیا فائدہ ہوا؟ آدمی سفر پر جاتا ہے تو وہاں سے بھی ٹیلی فون' ٹیلی گرام اور ٹیلیکس کے ذریعہ سے یہ کام کرتا ہی رہتا ہے۔ تو اگر یہی کام وہ اعتکاف کی حالت میں بھی کرتا رہے تو کیا فرق واقع ہوا؟ اعتکاف فرض تو ہے نہیں کہ ہر حال میں ادا کرنا ہے' خواہ طبیعت آمادہ ہو یا اس پر جبر کرنا پڑے۔ نماز چونکہ فرض ہے اس لیے بہر حال ادا کرنی ہے' چاہے حالت ِ نماز میں کتنے ہی وسوسے آئیں' اس سے مفر نہیں۔ لیکن نفل نماز کے بارے میں تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر طبیعت آمادہ ہو' اس میں نشاط ہو' دل لگتا ہو تو ادا کرو' اس کو زبردستی اپنے اوپر فرض نہ کر لو۔ یہی معاملہ اعتکاف کا ہے۔ اگر طبیعت اس کی پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ ہو تو اعتکاف کیجیے! یہ فرض نہیں ہے۔ البتہ مسنون ہے اور نبی اکرم ﷺ اس کی بڑی پابندی فرمایا کرتے تھے۔ اس کی اصل روح ''تبتُّل اِلی اللہ'' ہے' جیسے سورۃ المزمل میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا: {وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا ؕ ﴿۸﴾} ''اور ذکر کیے جاؤ اپنے رب کے نام کا اور سب سے الگ ہو کر پورے کے پورے اُسی کے ہو رہو''۔ چنانچہ اعتکاف میں اللہ کا ذکر ہو' اُس کی یاد کو دل میں نقش کالحجر بنانے کی شعوری کوشش ہو' اُس سے دعا ہو' استغفار ہو' قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہو' اس پر تدبر ہو۔ الغرض ان ایام کے لیے یکسر نئے معمولات ہوں۔

اعتکاف کی حج سے مماثلت

مَیں اس موقع پر اختصار سے عرض کروں گا کہ حج میں بھی اسی طور سے معمولات کو بدلنے کا معاملہ ہوتا ہے۔ حج کے متعلق آپ حضرات نے یہ الفاظ تو ضرور سنے ہوں گے کہ ''اَلۡحَجُّ عَرَفَۃ'' یعنی حج کا رکن۔ رکین وقوفِ عرفہ ہے۔ اگر وہ فوت ہو گیا تو حج نہیں ہوا۔ باقی کوئی رکن رہ جائے تو اس کا بدل ہے' اس کی قضا ہو سکتی ہے' اس کے لیے دم دیا جا سکتا ہے' اس کے لیے روزے رکھے جا سکتے ہیں' لیکن اگر وقوفِ عرفہ نہیں ہوا تو حج نہیں ہوا۔ یہ اس کی شرطِ لازم ہے۔ جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں عجیب حکمت رکھی گئی ہے کہ جس طرز کی عبادت کے لوگ عادی ہو چکے ہوتے ہیں' وہ وہاں بند کر دی گئی ہے۔ عرفہ میں کوئی نماز نہیں۔ ظہر

کے ساتھ ہی عصر پڑھ کر عرفہ میں داخل ہونا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بہت سے لوگ عرفات میں جا کر نمازِ ظہر و عصر پڑھ لیتے ہیں۔ پھر یہ کہ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد عرفہ سے روانگی ہے' لیکن مغرب کی نماز وہاں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مغرب کی نماز کافی تاخیر سے مزدلفہ میں جا کر ادا کرنی ہوتی ہے اور اس کے فوراً بعد عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اب یہ بظاہر عجیب بات ہے۔ لوگ تو ہر نماز اُس کے وقت پر پڑھنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں' ظہر اپنے وقت پر' عصر اپنے وقت پر اور اِدھر سورج غروب ہوا اُدھر مغرب کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہاں آپ سورج غروب ہونے سے قبل عرفہ سے نہیں جا سکتے۔ جو لوگ جاتے ہیں وہ غلط کرتے ہیں۔ یہ فرق کیوں ہے؟ تاکہ وہ معمول (routine) والی عادت جو مزاج کا جزو بن گئی ہے' اسے ختم کر کے' اس کے برعکس کام کرایا جائے۔ وقوفِ عرفہ کی اصل حکمت یہ ہے کہ اگر واقعی اللہ کی طرف انابت ہے تو لوگ وہاں اللہ سے زیادہ سے زیادہ دعا کریں۔ جس طرح چاہیں اس سے مناجات کریں' اس سے ہم کلام ہوں' اس سے لو لگائیں' اس سے عفو و مغفرت طلب کریں۔ یہ ہے وقوفِ عرفہ کی اصل غرض و غایت۔

یہی ہے اعتکاف کی اصل روح کہ آدمی اپنے معمولات سے منقطع ہو کر اللہ کے گھر میں آ کر ڈیرا لگا لے۔ وہ ہو اور اُس کی تمام تر توجہات کا مرکز و محور اللہ کی یاد بن جائے' ہر

آن اُس سے لو لگی رہے اور دس دن تک عملاً یہ نقشہ ہو کہ {یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ} (آلِ عمران: ۱۹۱) یعنی اللہ ہی کی یاد ہو کھڑے بھی' بیٹھے بھی اور کروٹ کے بل لیٹے بھی۔ اللہ کے ذکر سے آپ کے قلب کو وہ اطمینان' راحت اور سکون ملے گا جس کے سامنے ساری دنیا ہیچ ہے۔ خود باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: {اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُہُمۡ بِذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾} (الرعد) ''جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ آگاہ رہو کہ دل اللہ ہی کی یاد سے اطمینان و سکون پاتے ہیں''۔ دلِ مضطر ذکرِ الٰہی کے ذریعے ہی مکروہاتِ دنیا کے تکدر سے پاک ہو کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

منتشر رہتا ہے مکروہاتِ دنیا سے بہت اس دلِ مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!

درحقیقت اعتکاف کی مسنون عبادت کا مقصود ہی یہ ہے کہ مکروہات اور مسائلِ دنیا سے ذرا تعلق منقطع کرو اور اللہ سے لو لگاؤ' اُسی کی طرف توجہات کا ارتکاز کرو' اُس سے مناجات کرو' اُس سے مغفرت طلب کرو' اُس سے پچھلے گناہوں کی معافی چاہو۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جو آخری عشرے کے لیے مساجد میں معتکف ہو رہے ہیں' توفیق عطا فرمائے کہ اعتکاف کی اس مسنون عبادت کا حق ادا کریں۔

اعتکاف میں لیلۃ القدر کا حصول

معتکف حضرات کو اس مسنون عبادت کے اجر و ثواب کے ساتھ ایک عظیم عبادت کی سعادت بلاتکلّف نصیب ہو جاتی ہے' جس کی فضیلت کے بیان میں قرآن مجید کی ایک مکمل سورۃ مخصوص ہے' یعنی لیلۃ القدر ۔ یہ وہ رات ہے جس میں قرآن مجید لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا پر نازل کیا گیا تھا۔ بعد میں دعوت ِتوحید جن مراحل سے گزرتی رہی' انہی اعتبارات سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن مجید کو حضرت جبرائیل علیہ السلام قلب ِمحمدی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام پر نازل فرماتے رہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی ترتیب نزولی اور ہے جب کہ جو مصحف ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کی ترتیب اور ہے۔ مصحف کی ترتیب لوحِ محفوظ کے مطابق ہے اور اسی ترتیب سے نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید اُمّت کو دے کر اس دنیا سے ''الرَّفِیْقُ

الْاَعْلٰی'' کی طرف مراجعت فرمائی تھی۔

حضور ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ میں رمضان المبارک کی عظمت سے متعارف کرانے کے لیے جو خطبہ دیا تھا' اس خطبے میں الفاظ آتے ہیں: ''شَھْرٌ عَظِیْمٌ ' شَھْرٌ مُبَارَکٌ' شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ شَھْرٍ''۔یعنی ''یہ بڑا عظمت والا مہینہ ہے' بڑا بابرکت مہینہ ہے' اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے''۔ اس لیلۃ القدر کے متعلق دوسری احادیث صحیحہ میں آتا ہے کہ یہ رات آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ہوتی ہے' ان میں اسے تلاش کرو۔ معتکف حضرات کو اس رات کی تلاش میں خاص تکلّف و اہتمام نہیں کرنا ہو گا۔ وہ ان شاء اللہ اس رات کی برکات کو پالیں گے۔

لیلۃ القدر کی خصوصی دعا

اس رات کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر مجھے یہ رات نصیب ہو جائے تو مَیں اس میں اپنے رب سے کیا دعا مانگوں؟تو آپ ﷺ نے انؓ کو یہ دعا تلقین فرمائی: ((اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ))(سنن الترمذی)''اے اللہ' بے شک تُو بہت معاف فرمانے والا ہے اور معافی کو پسند فرماتا ہے پس تُو مجھے بھی معاف فرما دے۔''اس دعا کی عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی محبوب ترین زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ لہٰذا ان راتوں میں ہم میں سے ہر ایک کو یہ دعا کثرت کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔

نفلی اعتکاف

ایک بات مزید عرض کر دوں کہ رمضان کے آخری عشرے کے مسنون اعتکاف کے علاوہ اعتکاف کی ایک نفلی شکل بھی ہے۔ آپ ایک دن' ایک رات' ایک گھنٹہ حتیٰ کہ پانچ منٹ کا بھی اعتکاف کر سکتے ہیں۔ اس کی

صورت یہ ہے کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوں تو اعتکاف کی نیت کر لیں۔ اب آپ نے جتنے وقت کی نیت کی ہے' اتنا وقت بس اللہ سے لو لگانی ہے' باقی ہر نوع کی دُنیوی باتیں چھوڑ دینی ہیں۔ یہ نفلی اعتکاف ہے۔ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان' نبی اکرم ﷺ اُمّت کے حق میں اتنے شفیع' اتنے رئوف اور اتنے

رحیم تھے کہ اتنے مختصر وقت کے اعتکاف کی نیت اور اس پر صحیح عمل پر بھی ہمیں اجر و ثواب کی بشارت دے گئے ہیں۔

رمضان المبارک اس قرآن کے نزول کا مہینہ ہے۔ روزوں سے ہمارے اندر تقویٰ اس لیے پیدا کرنا مقصود ہے کہ تقویٰ نہیں ہوگا تو قرآن سے استفادہ نہیں کر سکو گے۔ یہ ''ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ'' ہے۔ دن میں روزہ رکھو' رات کو قرآن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جاگو۔ اس سے تمہارے دل کے اندر انابت پیدا ہو گی' رجوع پیدا ہوگا' خشوع پیدا ہوگا' قرآن کی عظمت تم پر منکشف ہوگی۔ پھر جب یہ خشوع انتہا کو پہنچ جائے تو آخری عشرے میں سب سے منہ موڑ کر آئو اور اللہ کے گھر کے کسی کونے میں اللہ سے لو لگانے کے لیے یکسو ہو کر بیٹھ جائو۔ اس سے مناجات کرو' دعائیں کرو' اس کی کتابِ مبین کی تلاوت کرو اور ان ذرائع سے اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرو۔ یہ ہے اعتکاف کی مسنون عبادت کی روح اور اس کی اصل غرض و غایت۔ اللہ تعالیٰ ہر معتکف کو ان روحانی برکات سے بہرہ مند فرمائے۔

اہلِ پاکستان کے لیے لمحہ فکریہ

رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ستائیسویں شب خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور اسلامیانِ پاکستان کے لیے اس کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ ستائیس رمضان المبارک کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ''پاکستان'' کے نام سے قائم ہوئی تھی' جسے بعد ازاں ہم نے اپنی بدعملی اور ناہنجاری کے باعث دو لخت کرادیا۔ موجودہ پاکستان وہ نہیں ہے جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا۔ ہمارا ایک بازو ہم سے ٹوٹ چکا' اُس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔ یہ بہت بڑا المیہ اور بہت بڑا حادثہ ہے اور بہت بڑی سزا ہے جو ہمیں اللہ کی طرف سے ملی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ سے اور خلقِ خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ اِلا اللہ!'' لیکن ہم نے اس عہد کی خلاف ورزی کی۔ مادّی اعتبار سے ہم نے چاہے کتنی ترقّی کی ہو' لیکن واقعہ یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے ہماری حالت بڑی دگرگوں ہے۔ عالَم یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت جو تھوڑی بہت دینی اور اخلاقی اقدار ہماری قوم میں موجود تھیں' ان کا بھی دیوالیہ نکل چکا ہے

اور ہم روز بروز دینی و اخلاقی اعتبارات سے انحطاط سے دوچار ہوتے اور پستی میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہماری سرحدوں پر کئی اطراف سے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ پھر سب سے بڑا خطرہ باہر سے نہیں' اندر سے ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں: {اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ}(آیت ۶۵)یعنی عذاب یا تو آسمان سے نازل ہوتا ہے'مثلاً آندھی یا طوفان آگیا' کوئی طوفانی بارش آگئی' کوئی سائیکلون آگیا یا اسی طرح کی کوئی اور آسمانی آفت نازل ہو گئی ----- یا ہمارے قدموں سے کوئی عذاب پھوٹ پڑے' مثلاً زلزلہ آجائے' خسف ہو جائے' زمین کو دھنسا دیا جائے' جیسے قارون کو اُس کے محل سمیت دھنسا دیا گیا تھا یا جس طریقہ سے عامورہ اور ثمود کی بستیاں تباہ کی گئیں' یا جس طرح زمین سے چشمہ پھوٹا تھا جس کے پانی اور آسمان کی بارش نے مل کر طوفانِ نوح کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ان کے علاوہ ایک تیسرا عذاب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کو نہ آسمان سے کچھ نازل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ زمین سے کچھ نکالنے کی۔ وہ کیا ہے ! وہ بدترین عذاب ہے : {اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ } '' یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا دے''۔اس صورت میں آسمان یا زمین سے عذاب بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت آپس میں آزمائو ! ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ایک دوسرے کا گریبان ہو' ایک دوسرے کے خنجر ایک دوسرے کے سینے میں پیوست ہو جائیں' ایک دوسرے کے گھر خود جلائیں' ایک دوسرے کو خود ہی ذبح کریں----- عذاب کی یہ شکل پہلے مشرقی پاکستان میں دیکھنے میں آئی۔ وہاں مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کی جان گئی' عزّت و آبرو لٹی۔ سکھر میں ایک صاحب نے اپنی آپ بیتی مجھے سنائی کہ ہم سترہ افراد تھے جن کو مکتی باہنی کے لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ یہ غنڈے نہیں تھے' کیونکہ ہمیں باندھنے والوں نے وضو کیا اور نفل ادا کیے اور دعا

لی کہ ''اے اللہ' ہم ان کو قتل کر رہے ہیں' تُو جانتا ہے کہ یہ ظالم ہیں' انہوں نے ہمارا خون چوسا ہے' انہوں نے ہمارے حقوق غصب کیے ہیں' اس کے بدلے ہم انہیں قتل کر رہے ہیں''۔ اس دعا کے بعد ان سترہ افراد پر گولیاں برسائیں' جن میں راوی بھی شامل تھے۔ ان کو گولی نہیں لگی' لیکن وہ مردہ بن کر گر پڑے اور اس طرح بچ گئے۔ پھر کسی نہ کسی طرح پاکستان آگئے۔یہ بدترین عذاب کی شکل ہے۔یہ ''الفتنۃُ الکبریٰ'' ہے جو ہمارے یہاں نمودار ہوا۔

مَیں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس بچے کھچے پاکستان میں حالات اسی رخ پر جا رہے ہیں۔ خاص طو رپر سندھ اور اس کا ہی نہیں پاکستان کا عروس البلاد کراچی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ کراچی میں پٹھان اور

بہاریوں کے درمیان نہایت خونی اور خوفناک تصادم ہو چکا ہے۔ چھوٹے چھوٹے عذابوں کا مزا اللہ ہمیں چکھا رہا ہے کہ ہم اب بھی ہوش میں آ جائیں۔ ایک منی بس میں پندرہ سولہ افراد کو جنہوں نے زندہ جلایا تھا وہ جلانے والے کون تھے؟ جلانے والے بھی مسلمان اور جلنے والے بھی مسلمان -----اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی علاقے اور بستی سے مختلف گروہوں میں مسلح تصادم کی خبریں آ رہی ہیں۔ اسی رمضان کے اوائل میں ان لڑائیوں کی وجہ سے بعض علاقوں میں کرفیو لگ چکے ہیں۔ یہ ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہیں (۱)۔ یہ اسی عذاب کے آثار ہیں جو پہلے مشرقی پاکستان میں اپنی پوری شدّت سے آ چکا ہے۔

ہمارے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ عذاب کے یہ کوڑے ہماری پیٹھوں پر کیوں برس رہے ہیں؟ معاذ اللہ' اللہ ظالم نہیں ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا: {وَمَا ظَلَمَہُمُ اللّٰہُ وَلٰکِنْ اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾}یعنی ''اللہ نے تو ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے''۔ یہی مضمون سورۃ الاعراف کی آیات ۱۶۰-۱۶۲ اور ۱۷۷ میں ہے۔ مزید برآں بہت سی سورتوں میں اس کا ذکر ہے۔ پھر سورۂ یونس میں یہ بات بڑے

---

(۱) خیال رہے کہ یہ تقریر ۳۰ مئی ۱۹۸۶ء کو کی گئی تھی۔ اس کے بعد کراچی جس باہمی مسلح تصادم اور آگ و خون کے دریا سے مسلسل گزرتا رہا ہے' اس پر ہر دردمند دل خون کے آنسو رویا ہے۔ (مرتّب)

واضح انداز میں فرمائی گئی: {اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾}یعنی ''اللہ تو لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا' لیکن لوگ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں''۔ یہ ہمارے اپنے کرتوت اور ہماری بداعمالیاں ہیں' بقول شاعر ع ''اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست''۔ ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے یہ اللہ کی تنبیہات ہیں۔ یہ سب کیوں ہے؟ اسے ایک جملہ میں سمجھ لیجیے۔ جس وعدے پر ہم نے یہ ملک بنایا تھا ہم نے اس کا ایفا نہیں کیا' بلکہ وعدہ خلافی کی ہے۔ ہم نے غداری کی ہے۔ ہم نے اسلام کے لیے یہ ملک بنایا تھا' لیکن ہم نے زبانی کلامی باتوں کے علاوہ اسلام کے نفاذ اور اسلامی نظام کے قیام کی طرف قطعی پیش قدمی نہیں کی' بلکہ ترقی معکوس کی ہے۔ دینی اور اخلاقی تربیت سے بحیثیتِ قوم و ملت ہم روز بروز گرتے چلے جا رہے ہیں۔ اب ہم اگر اس خوفناک صورتِ حال سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد علاج ایک ہی ہے کہ ایک طرف خود اپنی زندگیوں پر اسلام کو نافذ کریں' دوسری طرف اللہ کے دین کو عملاً اس ملک میں قائم کرنے کے لیے صحیح نہج پر جدّوجُہد کریں۔ اگر ہم اس کام کے لیے بیڑا اٹھا لیں تو ہماری بگڑی بن سکتی ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے: {اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ﴿۷﴾} (محمد) یعنی ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا''۔ اللہ کی مدد سے

مراد کیا ہے ! اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنے کی ہمہ تن ' ہمہ وجوہ اور ہمہ وقت جدّوجُہد کرنا ----- -----جگر مراد آبادی نے اس مفہوم کی بڑی دلنشین انداز میں ترجمانی کی ہے ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی !

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالے اور پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنا دے تاکہ ہم دنیا کو پاکستان کے ذریعہ سے اسلام کی برکات سے روشناس کرا سکیں۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

اسلام کی دو سالانہ عیدیں

عید الفطر اور عید الاضحی

اور اس موقع پر فقراء و مساکین کا لحاظ

۱۹۷۸ء کی ایک نشری تقریر

عید الفطر اور عید الاضحی دو عظیم عبادات اور اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے دو اہم ارکان کے ساتھ ملحق ہیں۔ عید الفطر صومِ رمضان کے ساتھ اور عید الاضحی حج بیت اللہ کے ساتھ۔ ان دونوں میں ایک طرف دوگانۂ شکرانہ مع اضافی تکبیرات اور نماز کے لیے جاتے اور آتے ہوئے غلغلۂ تکبیر بلند کرتے رہنا مشترک ہیں' جس کا حکم قرآن میں بھی موجود ہے۔چنانچہ سورۃ البقرۃ میں صومِ رمضان سے متعلق آیت کا اختتام بھی ان الفاظ مبارکہ پر ہوا کہ :{وَ لِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ وَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾}

''اور تاکہ تم پوری کرو تعداد اور تکبیر کرو اللہ کی اُس ہدایت پر جو اُس نے تم کو دی اور تاکہ تم شکر کرو!''

اور سورۃ الحج میں فرمایا:{كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمۡ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۳۷﴾}

''اور اس طرح اس نے ان (قربانی کے جانوروں) کو تمہارے لیے مسخر کر دیا'

تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اُس ہدایت پر جو اُس نے تمہیں عطا فرمائی اور (اے نبی ﷺ) بشارت سنا دیجیے احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو!''

اسی طرح دونوں عیدوں کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے غرباء و فقراء اور محتاجوں اور مسکینوں کے لیے خاص اہتمام رکھا ہے۔ عید الاضحی کے موقع پر یہ ضرورت قربانی کے گوشت کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔چنانچہ سورۃ الحج میں دوبار فرمایا کہ اس میں سے خود بھی کھائو اور غرباء و مساکین کو بھی کھلائو۔چنانچہ پہلے فرمایا:{فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَ اَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِيۡرَ ﴿۲۸﴾} ''کھائو اُس میں سے خود بھی اور کھلائو فاقہ کش فقیروں کو بھی۔''دوبارہ پھر فرمایا:{فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَ اَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَ الۡمُعۡتَرَّ ؕ} (آیت ۳۶)یعنی کھائو اس میں سے خود بھی اور کھلائو ان قانع لوگوں کو بھی جو صاحب اِحتیاج ہونے کے باوجود صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں ----- اوران کو بھی جو بے تاب ہو کر دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

عید الفطر کے موقع پر اسی غرض کے تحت اسلام میں صدقۂ فطر کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس خوشی میں صاحبِ استطاعت لوگوں کے ساتھ غرباء و مساکین بھی شامل ہو جائیں۔ یہ صدقہ ہر اُس مسلمان پر واجب ہے جو صاحب نصاب ہو' اور پھر اُس کو وسعت یہ دی گئی ہے کہ ایسا شخص صرف اپنی ہی طرف سے یہ صدقہ نہ کرے بلکہ اپنے زیر کفالت ہر ذی نفس کی جانب سے ادا کرے' یہاں تک کہ ایک بچہ اگر عین عید کی صبح کو تولد ہوا ہو تو اُس کی جانب سے بھی صدقہ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ صدقۂ فطر کا ذکر اگرچہ قرآن میں تو موجود نہیں ہے تاہم متعدد احادیث نبویہ علی صاحبھا الصلوۃ والسلام میں اس کا ذکر نہایت وضاحت اور غایت درجہ تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا:

فَرَضَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَکَاۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِنْ شَعِیْرٍ، عَلَی الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّکَرِ وَالْاُنْثٰی وَالصَّغِیْرِ وَالْکَبِیْرِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، وَاَمَرَ بِھَا اَنْ تُؤَدّٰی قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَی الصَّلَاۃِ

''نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے مسلمانوں میں سے ہر غلام اور آزاد' ہر مرد و عورت اور ہر

چھوٹے بڑے پر صدقۂ فطر 'ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو' لازم کیا ہے' اور حکم دیا ہے کہ یہ صدقہ نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے!''

اس حدیث میں اگرچہ اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ یہ صدقۂ فطر صرف صاحبِ نصاب پر واجب ہے' لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے اور عقل سلیم کے لیے اس کا جاننا کچھ مشکل نہیں۔ کھجوروں اور جَو کی وضاحت اس لیے کی گئی کہ یہی اہلِ مدینہ کی عام خوراک تھی۔ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو سے متوسط افراد پر مشتمل ایک کنبے کی ایک دن کی غذائی ضروریات کی کفالت ہوجاتی تھی۔ گویا ایک صاحبِ نصاب شخص کے گھر میں اگر کُل افراد دس ہیں تو اُس کے صدقہ فطر سے غریب مسلمانوں کے دس گھرانوں کی ایک دن کی خوراک کا انتظام ہو گیا۔

صاع کے تعین میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک وہ ہمارے اوزان کے اعتبار سے ساڑھے تین سیر کے لگ بھگ ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے نصف' یعنی پَونے دو سیر کے لگ بھگ۔ اس کے تعین کے لیے لوگوں کو اپنے اپنے معتمد علیہ علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے' اور چونکہ ہمارے یہاں کی عام خوراک گندم ہے لہٰذا ساڑھے تین سیر یا پَونے دو سیر گندم کی جو قیمت بازار میں ہو اُس کے حساب سے ہر ہر فردِ خانہ کی جانب سے صدقۂ فطر ادا کرنا چاہیے۔

نمازِ عید کے لیے گھر سے روانگی سے قبل صدقۂ فطر کی ادائیگی کی تاکید کا اصل مقصود یہی ہے کہ غرباء و مساکین بھی عید کی خوشیوں میں آسودگی کے ساتھ شریک ہوسکیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان آبادی میں لوگ عید کی خوشیاں منا رہے ہوں جبکہ اسی علاقے میں کوئی مسلمان گھرانہ فاقے سے ہو! صدقۂ فطر کی اس حکمت کو اس روایت

میں بیان کیا گیا ہے جو سنن ابی داؤد میں وارد ہوئی ہے ------- یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ‘آپؓ نے فرمایا:
فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ زَکَاۃَ الْفِطْرِ طُھْرًا لِلصِّیَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَۃً لِلْمَسَاکِیْنِ

167

’’رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر اس لیے واجب اور لازم کیا ہے کہ لوگوں کے روزے اگر فضول اور لایعنی گفتگو یا کسی فحش بات کے باعث آلودہ ہو گئے ہوں تو اس سے پاک ہو جائیں اور ساتھ ہی محتاجوں اور مسکینوں کے کھانے کا بندوبست ہو جائے !‘‘

ان دونوں احادیث میں صدقۂ فطر کے لیے ’’زکوٰۃ الفطر‘‘ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ یہاں اصل اشارہ اسی جانب ہے کہ جیسے فرض زکوٰۃ کا اصل حاصل لوگوں کے دلوں سے مال کی محبّت کی نجاست کو دُور کرنا ہے تاکہ لوگوں کی سیرتوں اور شخصیتوں کی تعمیر ان خطوط پر ہو سکے جو اُن کے خالق و مالک کو پسند ہیں‘ اسی طرح یہ زکوٰۃ الفطر درحقیقت روزوں کو معصیت کی آلودگی سے پاک کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ البتہ جس طرح فرض زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظامِ عدل و انصاف کا اہم رکن ہے جس کے ذریعے معاشرے کے ان لوگوں کی کفالت ہوتی ہے جو کسی سبب سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں اور اپنے پائوں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہوں‘ اسی طرح زکوٰۃ الفطر سے عید کی خوشی میں پس ماندہ لوگوں کی شرکت و شمولیت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔

اللہ ہمیں اوّلاً ماہِ صیام کی برکتوں سے کماحقہ مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس مبارک مہینے کے اختتام پر صدقۂ فطر ادا کرنے کی توفیق بھی دے تاکہ ہمارے غریب بھائی عید کی خوشیوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں۔ آمین‘ ثم آمین !

* * *

168

مسلمانانِ پاکستان کے لیے

قرآن حکیم کی عملی راہنمائی

جامع مسجد قرآن اکیڈمی، ڈیفنس، کراچی میں

دورۂ ترجمہ قرآن کی اختتامی نشست سے خطاب

(بتاریخ: ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ / ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

خطبہ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِہٖ وَ اَنَّہٗٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ اتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَآصَّۃً ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَ اذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمْ وَ اَیَّدَکُمْ بِنَصْرِہٖ وَ رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾ } (الانفال)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ

میری اس وقت کی گفتگو کا موضوع ہے: ''بحالاتِ موجودہ مسلمانانِ پاکستان کے لیے قرآن حکیم کی عملی راہنمائی۔'' الحمدللہ' ہم نے پورے ۲۵دن قرآن پڑھا ہے۔ بہت سے حضرات نے پابندی سے شرکت کی ہے اور پورے قرآن کے ترجمے سے گزرے ہیں۔ قرآن مجید میں کہیں گفتگو مشرکین سے' کہیں منافقین سے اور کہیں منکرین آخرت سے ہو رہی ہوتی تھی۔ کبھی یہود سے' کبھی نصاریٰ سے' کبھی مسلمانوں سے ۔ مکی اور مدنی سورتوں کا اپنا الگ الگ رنگ اور انداز ہے۔ پھر اس میں عبادات کے ضمن میں احکامِ الٰہیہ بھی آئے ہیں۔ معاشرتی احکام ہیں' عائلی قوانین ہیں۔ سیاسی نظام کے حوالے سے ہدایات آئی ہیں۔ ویسے تو قرآن مجید میں زندگی کے ہر گوشے اور ہر آنے والے دور کے لیے ہدایت ہے لیکن اس وقت مَیں نے دو اعتبارات سے عنوان معیّن کیا ہے یعنی ''بحالاتِ موجودہ'' اور ''مسلمانانِ پاکستان'' کے لیے قرآن حکیم کی عملی راہنمائی کیا ہے! البتہ پہلے قرآن مجید کی وہ راہنمائی جو اَبدی ہے' اساسی ہے' زمان و مکاں کی حدود سے ماورا ہے' اُس کا خلاصہ چند نکات کی شکل میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ہمارے بنیادی فرائض

۱)حقوق اللہ کی ادائیگی

پہلی بات یہ ہے کہ انسان اللہ کا حق ادا کرے' یعنی توحید پر یقین رکھے۔ توحید کا اعتقادی پہلو یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے۔ وہ اپنی ذات میں تنہا ہے۔ کوئی اُس کا مدّمقابل اور کفو نہیں ہے' نہ اس کی صفات میں نہ اُس کی ذات میں۔ توحید کے عملی پہلو پر ہم نے اس دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران چار سورتوں میں بڑی مفصل بحثیں کی ہیں۔ عملی توحید چار نکات پر مشتمل ہے۔ پہلا نکتہ سورۃ الزمر کا مرکزی مضمون ہے۔ اللہ کی عبادت اپنی اطاعت کو صرف اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے کی جائے: {فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ۲}۔ عبادت میں نماز' روزہ بھی شامل ہیں۔ لیکن ایسی عبادت جس کے ساتھ اللہ کی خالص اطاعت نہیں ہو رہی' وہ منقسم ہے۔ مثلاً کہیں اپنے نفس کی فرماں برداری ہو گئی

اور اللہ کی اطاعت کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس ضمن میں فرمایا گیا: {اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰہَہٗ ہَوٰىہُ}(الجاثیۃ:۲۳)''کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے!'' نفس ہی اُس کا حقیقی مطاع ہے۔ زبان سے تو وہ ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' کہتا ہے جبکہ دل میں خواہش نفس کو اِلٰہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ کی خالص اطاعت وہی ہوگی جو کلی طور پر کی جائے گی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً}(البقرۃ:۲۰۸)اگر اطاعت ِالٰہی زندگی کے کچھ حصے میں کی جائے اور کچھ میں نہ کی جائے' گویا اطاعت کے حوالے سے انسان خود کو تقسیم کرلے تو اس پر قرآن حکیم میں بڑی سخت وعید آئی ہے:

{ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾} (البقرۃ)

''کیا تم کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے! تو جو کوئی بھی یہ روش اختیار کرے گا اُس کی اس کے سوا کوئی سزا نہیں ہے کہ (ایسے لوگ) دُنیا میں تو ذلیل و خوار کر دیے جائیں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائیں۔''

لہٰذا عبادت میں ''مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ'' ہونا ضروری ہے۔

اسی کا ایک اور پہلو دعا ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الۡعِبَادَۃِ))''دعا عبادت کا مغز (جوہر) ہے۔'' اور ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الۡعِبَادَۃُ))''دعا ہی دراصل عبادت ہے۔'' (سنن الترمذی)یہ سورۃ المؤمن کا مرکزی مضمون ہے۔ {فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ} (المؤمن:۱۴)''پس تم اللہ کو پکارو اُسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''اگر اللہ کے ساتھ پوری وفاداری نہیں ہے تو پھر کس منہ سے دعا کی جا رہی ہے! اس حوالے سے ایک حدیث مبارکہ بھی ہے۔ایک شخص حج کے لیے گیا ہے اور جبل رحمت پر ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہا ہے: یَارَبِّ،یَارَبِّ! وَمَطۡعَمُہٗ حَرَامٌ، وَمَشۡرَبُہٗ حَرَامٌ، وَمَلۡبَسُہٗ حَرَامٌ، وَغُذِیَ بِالۡحَرَامِ، فَاَنّٰی یُسۡتَجَابُ لِذٰلِکَ! (صحیح مسلم)''جبکہ

اُس کا کھایا ہوا حرام کا ہے‘ پیا ہوا حرام کا ہے ‘اُس کا لباس حرام (کمائی) کا ہے‘ اور وہ حرام غذا سے پلا بڑھا ہے تو اُس کی دعا کیسے قبول ہو ! ‘‘ دعا اگرچہ مُخُّ الْعِبَادَۃُ‘ ھُوَ الْعِبَادَۃُ ہے‘ لیکن یہ اس حال میں کی جانی چاہیے کہ بندہ یکسو ہو کر اپنی کل اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لے۔

اس سے اگلا قدم کسی ایک فرد سے دوسرے فرد کو دعوت ہے۔ اب اسی کے داعی بن کر کھڑا ہوا جائے۔ لوگوں کو اسی کی دعوت دی جائے کہ وہ بھی اللہ کی بندگی کریں‘ اِللہ ہی کو پکاریں۔ فرمایا:

{وَ مَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾ } (حٰمٓ السجدۃ)

’’اور اُس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو بلائے اللہ کی طرف اور وہ نیک عمل کرے اور کہے کہ مَیں مسلمانو میں سے ہوں۔‘‘

یہ سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی مرکزی آیت ہے۔

چوتھا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ ’’مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنُ‘‘ کی حالت کیسے حاصل ہو ! ملک میں قانون کسی اور کا چل رہا ہے۔ عدالتیں اسی قانون کے مطابق فیصلے کر رہی ہیں۔ معاشی نظام احکامِ الٰہی پر مبنی نہیں ہے۔ کاروبار اور لین دین کی بنیاد سود پر ہے۔ صنعت اور حکومت کے تمام مالیاتی امور سود پر قائم ہیں۔ ہم بھی تو اسی ملک کے شہری ہیں۔ ایسے میں ’’مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنُ‘‘ کا مقصد اُسی وقت پورا ہو گا جب پورے نظامِ زندگی پر اللہ کی اطاعت کا سکہ قائم ہو جائے۔ اس کا نام ہے اقامت ِدین۔ چنانچہ سورۃ الشوریٰ کا مرکزی مضمون یہی ہے :

{شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ} (الشوریٰ:۱۳)

’’(اے مسلمانو !) اللہ نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوح کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی

طرف کی ہے‘ اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔‘‘

اس حوالے سے قرآن مجید میں دو ٹوک الفاظ میں ارشاد ہے :{وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ }(المائدۃ)’’اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔‘‘ہماری عدالتوں میں فیصلے تو اللہ کے قانون کے مطابق نہیں ہو رہے ہیں۔ فیصلے کرنے والے‘ فیصلے کروانے

والے‘ فیصلے ماننے والے‘ فیصلے نافذ کرنے والے‘ فیصلوں کی تنفیذ کرنے والے سب اس کی زد میں آ رہے ہیں۔ اگلی آیت مبارکہ{وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾}کی رو سے وہی تو ظالم ہیں‘مشرک ہیں۔اور{ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾ } کے مطابق وہی تو باغی ہیں‘سرکش ہیں۔ لہٰذا اس ساری صورتِ حال سے نکلنے کی صرف ایک شکل ہے کہ ہمہ تن‘ ہمہ وقت دین کو قائم کرنے کی جدّوجُہد کی جائے۔اس نظامِ باطل کے ساتھ reconsile نہ کیا جائے‘ نہ ذہناً نہ قلباً۔ اگر کوئی اور راستہ نہیں ہے تو under protest رہیں کہ مَیں نے اس نظام کو دل اور دماغ سے قبول نہیں کیا۔ مَیں اس سے صرف اسی قدر استفادہ کروں گا جو میری بقا کے لیے ضروری ہے جبکہ اپنی ساری توانائی‘ قوت‘ صلاحیت اور سارے وسائل و ذرائع اس نظام کو جڑ سے اکھیڑ کر اس کی جگہ اللہ کا دیا ہوا نظام قائم کرنے کے لیے وقف کردوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں ہے۔

اسی کا نام تکبیرِ ربّ ہے‘یعنی اپنے رب کو بڑا کرو: {وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ﴿۳﴾ } (المدثر) اسی مقصد کے لیے رسولِ اکرم ﷺ مبعوث فرمائے گئے: {ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ } (التوبۃ:۳۳‘الفتح:۲۸‘الصف:۹) ’’وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ وہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر۔‘‘اسی کے لیے ارشاد ہوا: {وَ قَاتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ } (الانفال: ۳۹)’’اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں

تک کہ فتنہ (کفر) باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کا ہو جائے۔‘‘یہ تمام اصطلاحات ’’عباراتنا شتّٰی وحُسنکَ واحد‘‘کا مصداق بنیں۔ مطلب ایک ہی ہے کہ دین کو قائم کرو‘ دین کے مکمل نظام کو برپا کرو تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشے اللہ کی اطاعت کے اندر آجائیں۔ اس کے بغیر اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا‘ جو کہ سب سے پہلا کام ہے۔ یہ جو فرمایا گیا {وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ } (الذّٰریٰت) ’’مَیں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے‘‘تو اس عبادت کے یہ لوازم ہیں: {فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ؕ ﴿۲﴾ }(الزمر)۔ {فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ}(المؤمن:۱۴)۔ اسی کی دعوت دوسروں کو دو۔{اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ} (النحل:۱۲۵) ’’(اے نبی ﷺ!) آپ دعوت دیجیے اپنے ربّ کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ‘ اور ان سے بحث کیجیے بہت اچھے طریقے سے۔‘‘اللہ کے دین کو بتمام و کمال قائم کرنے کے لیے تن من دھن لگا دو۔

۲)رسول اللہ ﷺ کے حقوق کی ادائیگی

اللہ کے بعد دوسرا حق ہم پر رسول اللہ ﷺ کا ہے‘ جن کی بدولت ہمیں یہ ہدایت نصیب ہوئی۔ ہمارے ماں باپ کو ان کے والدین سے ملی‘ انہیں ان کے آباء سے ملی۔ اس میں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی

محنتیں ہیں۔ آپؐ کے صحابہؓ کی جدّوجُہد ہے:{مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ}(الفتح:۲۹)کیسی کیسی مشقتیں جھیلی گئی ہیں‘ تب یہ دین غالب ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے ہم پر سارے حقوق تو یہاں بیان نہیں ہو سکتے‘ البتہ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ آپ ﷺ تمام دنیا کے لیے اور قیامت تک کے انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر پانچ مرتبہ آیا ہے جن میں سب سے نمایاں دو آیتیں ہیں: {وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾} (الانبیاء)’’اور (اے نبی ﷺ !) ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔‘‘{وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا}(سبا:۲۸)’’اور (اے

نبی ﷺ !) ہم نے آپ کو سارے ہی انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔‘‘نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس اپنی رسالت کے فرائض ملک عرب اور قومِ عرب کی حد تک تو پورے کر دیے جبکہ باقی دنیا کے لیے اُس وقت بھی اور آنے والے ہر انسان کے لیے یہ فریضۂ رسالت اُمّت کے کندھے پر ڈال گئے۔ حجۃ الوداع میں گواہی لی گئی:((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟))’’کیا مَیں نے پہنچا دیا؟‘‘ اور جب جواب مل گیا: نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ‌یعنی ’’ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا‘ حقِ رسالت ادا کر دیا‘ حقِ نصیحت ادا کر دیا‘‘تو آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!))’’اے اللہ ! تُو بھی گواہ رہنا !‘‘ پھر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ)کہ اب لازم ہے ان پر جو یہاں موجود ہیں کہ پہنچائیں ان کو جو یہاں نہیں ہیں ۔گویا اب یہ بوجھ میرے کندھوں سے تمہارے کندھوں پر آگیا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اُمتی ہیں تو مقروض ہیں محمدٌرسول اللہ ﷺ کے۔ اگر یہ خواہش ہے کہ آپ ﷺ کی شفاعت ملے تو آپؐ کا حق ادا کرنا ہو گا۔

{وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ}(البقرۃ:۱۴۳)’’اور (اے مسلمانو !) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمّت ِوَسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔‘‘ اس کے کم سے کم دو تقاضے ہیں۔پہلا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک ایک فردِ نوعِ بشر کو قرآن حکیم کی تبلیغ اس اُمّت کے ذمے ہے۔ اگر قرآن نہیں پہنچایا تو اس کا مطلب ہے کہ محمدٌرسول اللہ ﷺ کی رسالت کا پیغام اُن تک نہیں پہنچا۔ ایسے میں قیامت کے دن اُمّت کیا جواب دے گی ! حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ: کِتَابَ اللّٰہِ)) (صحیح مسلم)’’مَیں تمہارے مابین ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر اس کو مضبوطی سے تھام لو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے‘ یعنی اللہ کی کتاب !‘‘اب پہنچانا تو اس کو نوعِ انسانی تک ۔سورۃ الانعام کی آیت کے مطابق : {وَاُوۡحِیَ

اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ} (الانعام:۱۹)''یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہےتاکہ تمہیں بھی خبردار کردوں اور اُن کو بھی جن تک یہ قرآن پہنچ جائے۔'' ان تک گویا کہ میرا انذار پہنچ جائے گا۔ قرآن پہنچانے کا یہ کام ہر اُمتی کے ذمہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ہم پر دوسرا حق یہ ہے کہ قابلِ قدر آبادی پر مشتمل دنیا کے کسی ایک ملک میں اسلام کا انفرادی و اجتماعی نظام پوری طرح قائم کر کے دکھا دیا جائے تاکہ سب دیکھ لیں کہ یہ کوئی خیالی جنّت (utopia)یا ناقابلِ عمل معاملہ نہیں ہے۔ دنیا دیکھ لے کہ اس کی برکات کیا ہیں ! سب کو علم ہو جائے کہ کس طرح کا معاشرہ وجود میں آتا ہے' کیسا معاشی انصاف ہوتا ہے ! مادر پدر آزادی نہیں ہے لیکن حریت موجود ہے۔ کمیونزم والی مساوات نہیں ہے لیکن حکومت ہر شہری کی بنیادی ضرورتوں کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتّا بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ ذمہ دار ہو گا۔ آج انسان ایک ایسے اجتماعی نظام کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے جس میں سیاسی' معاشرتی اور معاشی حوالے سے ساری خوبیاں ہوں۔ کبھی فرانسیسی انقلاب' کبھی بالشویک انقلاب' یہ سب اسی لیے ہے کہ ظلم اور استحصال سے پاک کوئی ایسا نظام ہو جس میں عدل و انصاف میسّر ہو' دولت کی منصفانہ تقسیم ہو۔ جب تک ہم ایسے نظام کو قائم کر کے نہیں دکھا دیں گے' یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم نے اللہ کے نبی ﷺ کا حق ادا کر دیا۔ ایسے میں دنیا کا یہ شکوہ بجا ہوگا کہ اگر مسلمان ایک اعلیٰ نظام کے حامل ہونے کے دعوے دار ہیں تو اُسے اپنے ہاں قائم کیوں نہیں کرتے ! ہمارا عمل ہمارے قول کی نفی کر رہا ہو گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا نہیں ہوتا جب تک کہ اسلام کو کلی طو رپر قائم نہ کیا جائے اور رسول ﷺ کا قرض بھی ادا نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ کے دین کا پورا نظام قائم نہ کیا جائے۔

۳)حقوق العباد کی ادائیگی

اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کے بعد ہم پر تیسرا حق بندوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کے حوالے سے کوئی کوتاہی یا کمی معاف بھی کر دے گا لیکن حقوق العباد کا معاملہ ایسا

نہیں ہے۔ بندوں کا حق یہ ہے کہ انہیں عدل و انصاف ملے ' اُن کے حقوق غصب نہ کیے جائیں۔ قرآن مجید میں یہ بات تکرار کے ساتھ آئی ہے' جسے ہم نے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔ اسلام کو ہم نے محض ایک مذہب بنا دیا ہے ۔ گویا یہ صرف آخرت سے متعلق ہے۔ یہاں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ظلم برداشت کر لو' آخرت میں تمہیں اس کا اجر مل جائے گا ۔اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ کارل مارکس نے کہا : Religion is the opium of the masses اس کے برعکس قرآن کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے ۔ اسلام تو عدل اجتماعی پر مبنی نظام عطا کرتا ہے۔ سورۃ آل

عمران میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرمایا گیا: {قَائِمًا م بِالْقِسْطِ}(آیت۱۸) کہ اللہ خود عدل کا قائم کرنے والا ہے۔ انبیاء ورُسل علیہم السلام کو اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ارشاد ہوا:{لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ} ''ہم نے اپنے رسول بھیجے معجزات دے کر اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل فرمائی ''۔ گویا حقوق اور فرائض کا توازن قائم کیا۔ یہ کوئی بے مقصد عمل نہیں تھا۔ یہ سارا کھکھیڑ اس لیے مول لیا گیا :{لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ}''تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں''۔ {وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ.....}''اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے جس میں جنگ کی صلاحیت ہے.....'' جو لوگ ظلم چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں ' لوہے کی طاقت کے ساتھ ان سے نمٹا جائے۔ آگے فرمایا: {وَ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ }''تاکہ اللہ جان لے (یعنی ظاہر کر دے) کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔'' اللہ دیکھ لے وہ کون سے بندے ہیں جو میرے وفادار ہیں' میرے نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے تن من دھن لگانے کو تیار ہیں' اپنی جانیں قربان کرنے پر راضی ہیں۔

انزالِ کتب اور ارسالِ رسل کا بنیادی مقصد دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا تھا۔ سورۃ الشوریٰ میں حضور ﷺ کو مخاطب کیا گیا کہ آپ کہہ دیجیے: {وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ}(آیت۱۵) ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں تمہارے مابین عدل قائم کروں۔''

سورۃ النساء میں مسلمانوں سے کہا گیا :{یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ}(آیت۱۳۵)''اے اہلِ ایمان ! عدل کو قائم کرنے والے بن کر کھڑے ہو جائو پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے گواہ بن کر۔'' اس لیے کہ اللہ خود قَائِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔ اس کی گواہی اسی طرح ہو گی کہ تم اُس کے نظامِ عدل و قسط کو قائم کرو۔ یہی مضمون سورۃ المائدۃ میں یوں بیان ہوا: {یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ } (آیت۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو ! کھڑے ہو جائو اللہ کے لیے 'راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جائو۔''اللہ کے لیے کھڑے ہونے کا کیا مطلب ہے؟کیا اللہ کی کوئی ضرورت پوری کرنی ہے ؟نہیں' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے نظامِ عدل و قسط کو قائم کرو۔

دین کا یہ پہلو سرے سے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ہے۔ انسانوں کا یہ حق ہے کہ انہیں ظلم سے نجات دلائی جائے۔ حضور ﷺ کی شان تو یہ تھی :{ وَ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ } (الاعراف:۱۵۷)کہ آپؐ نے آکر دُنیا والوں کی گردنوں میں پڑے طوق اُتارے ہیں۔ سود کی جڑ کاٹ کر سرمایہ داروں کی غلامی سے نجات دلائی۔ بادشاہت کی جڑ کاٹ کر سب کو برابر کر دیا۔ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی ' باقی بتانِ آزری !

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((یَا اَیُّھَا النَّاسُ کُوْنُوْا عِبَادَ اللہِ اِخْوَانًا))''لوگو ! سب کے سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ '' تم میں سے کوئی آقا نہیں ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں جب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم نے یہ سوال کیا کہ آپ ہم پر کیوں چڑھ دوڑے ہیں؟ پہلے بھی عرب کے بدو کبھی کبھی آتے تھے لیکن لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ اس دفعہ ہماری جان نہیں چھوٹ رہی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ رشتہ میں حضور ﷺ کے ماموں زاد بھائی لگتے ہیں۔ ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں

ہوتا ہے۔ ان کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ واحد صحابی ہیں کہ جن کے لیے حضور ﷺ نے کہا ہے : ''تم پر میرے ماں باپ قربان ! '' غزوہ اُحد میں جب حضور ﷺ پر کُفّار کا نرغا ہوا تو حضرت سعدؓ تیر بھی چلا رہے تھے اور دشمنوں کو روک بھی رہے تھے۔ حضور ﷺ ان کو اپنے ترکش میں سے تیر دیتے جاتے اور فرماتے : ((یَا سَعْدُ ' اِرْمِ فِدَاکَ اُمّی وَاَبی))(صحیح البخاری) ''سعد ! تیر چلاتے جاؤ ' تم پر میرے ماں باپ قربان۔ '' حضرت سعدؓ نے رستم کو یہ جواب دیا کہ اس مرتبہ ہم خود نہیں آئے بلکہ اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا ہمیں تو بھیجا گیا ہے۔ ہم ایک مشن پر ہیں۔ اللہ نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو اور اللہ کے رسول ﷺ نے بھیجا ہمیں۔ وہ مشن ہے : لِیُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَھَالَۃِ اِلٰی نُوْرِ الْاِیْمَانِ تاکہ لوگوں کو نکالیں جہالت اور جاہلیت کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی طرف ۔ وَمِنْ جَوْرِ الملوک الٰی عَدلِ الاسلام اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے نجات دلا کر اللہ کے نظامِ عدل کی طرف۔

اس نظام کا نمونہ ہمیں دورِ خلافت راشدہ میں ملتا ہے۔ اُس وقت دنیا کی عظیم ترین مملکت کے فرماں روا کے کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایران سے ایک سفیر مدینہ منورہ آیا تو لوگوں سے پوچھا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہوتا ہے؟ جواب ملا: لَیْسَ لَنَا مَلِکٌ ' بَلْ لَنَا اَمِیْرٌ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں ہے ' بلکہ ہمارا ایک امیر ہے۔ پوچھا گیا: کہاں ہے؟ کوئی محل نظر نہیں آیا ' وہ کہاں رہتا ہے ؟ بتایا گیا کہ اس کا محل تو کوئی ہے نہیں ' اس وقت وہ بیت المال کے گمشدہ اونٹوں کو تلاش کرنے گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتیجے میں جب پورے ہندوستان میں کانگریس کی وزارتیں بنی ہیں تو گاندھی نے اپنے اخبار ''ہریجن سیوک'' میں ایک مقالہ لکھا تھا کہ مَیں آپ کے سامنے ابوبکر اور عمر(رضی اللہ عنہما) کی مثالیں پیش کرتا

ہوں‘ ان کی پیروی کریں۔ یہ تھا وہ جادو جو سر چڑھ کر بولا !

لہٰذا یہ تین حقوق ہیں : اللہ کا حق اقامت ِدین‘ رسول ﷺ کا حق تبلیغ دین اور دین کا ایک عملی نمونہ دکھا دینا تاکہ حُجّت قائم ہو جائے‘ اور انسانوں کا حق کہ انہیں ظلم و ستم کے

پنجوں سے نجات دلا کر اسلام کے نظامِ عدل کے تحت لایا جائے۔ یہ تینوں حق جا کر مل گئے ہیں ایک ہی چیز پر جس کا نام ’’اقامت ِدین‘‘ ہے۔ یہ چیزیں جو مَیں نے بیان کی ہیں‘ دائمی اور ابدی ہیں۔ ایک مسلمان چاہے اکیلا ہو اور کہیں بھی ہو‘ اسے سمجھنا چاہیے کہ یہ میری ذمہ داریاں ہیں۔ آج شروع کرے‘ کل ایک اور آدمی مل جائے گا تو دو ہو جائیں گے۔ ایک اکیلا دو جماعت ! ایک اکیلا دو گیارہ ! کامیابی نہیں ملتی تو کوئی بات نہیں۔ فرض تو بہرحال ادا کرنا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس تک دعوت دیتے رہے‘ ظاہری اعتبار سے ناکام رہے۔ حقیقت میں تو کامیاب وہی ہوئے جبکہ باقی قوم ہلاک ہو گئی۔

قرآن حکیم میں پاکستان کا ذکر

اب مَیں چاہتا ہوں کہ خاص پاکستان کے حوالے سے بات کروں۔ پہلی بات تو یہ کہ ع ’’اپنی خودی پہچان‘ او غافل افغان !‘‘ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کی حقیقت کیا ہے ! کیا یہ دوسرے مسلمان ممالک ہی کی طرح ایک مسلم ملک ہے یا اس کی کوئی خصوصی اہمیت اور حیثیت ہے؟ کیا اس کا کوئی امتیازی مقام اور مرتبہ ہے؟

تحریک ِپاکستان کا پس منظر

قیامِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۶ کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا : {وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ}’’اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین میں دبا لیے گئے تھے‘ تم اس سے خوف زدہ تھے کہ لوگ تمہیں اُچک لیں گے‘‘۔ اِس وقت مَیں اس کی تفسیر نہیں کر رہا کہ اس آیت کا شانِ نزول کیا تھا اور اس کے نزول کے وقت کیا حالات تھے‘ بلکہ الفاظ کے عمومی مفہوم کے حوالے سے جس طرح یہ آیت تحریک پاکستان پر صد فی صد منطبق ہو رہی ہے‘ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب تم اقلیت میں تھے‘ تمہیں زمین میں دبا لیا گیا تھا۔ ہندو زیادہ بیدار‘ زیادہ سرمایہ دار اور زیادہ تعلیم یافتہ تھا جبکہ انگریز اُس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی‘

چنانچہ انہی سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ ہندو تو پہلے بھی غلام تھا اور اس کے لیے محض حکمرانوں کی تبدیلی کا معاملہ تھا۔ پہلے مسلمانوں کا غلام تھا' اب عیسائیوں کا ہو گیا۔ اسی لیے اسے مسلمان کے مقابلے میں اٹھایا گیا۔ اس سے مسلمانوں میں ایک خوف پیدا ہوا کہ جب انگریز ہندوستان سے چلا جائے گا تو پھر کیا ہو گا ! اب تو پھر بھی کسی نظام کی عمل داری ہے' جنگل کا قانون نہیں ہے۔ اگر یہ ملک آزاد ہو گیا تو دنیا کے مروّجہ اصولوں کے مطابق one man one vote کا معاملہ ہو گا۔ ایسے میں مسلمان تو پوری طرح ہندوئوں کے رحم و کرم پر ہوں گے ۔ ہندو اُن کی تہذیب' تمدن' ثقافت' زبان' معاش حتیٰ کہ مذہب تک پر حملہ کرے گا اور تقریباً ایک ہزار سالہ اپنی غلامی کا بدلہ چکانے کی کوشش کرے گا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اندرا گاندھی کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ: We have avenged our thousand-year slavery

مذکورہ آیت میں آگے ارشاد ہوا : {فَاٰوٰىكُمْ}''تو اللہ نے تمہیں پناہ دی۔'' پاکستان کے نام سے دو قطعاتِ ارضی دیے کہ تم اس میں حفاظت سے رہو۔ {وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ} ''اور اپنی نصرت سے تمہاری تائید فرمائی۔''{وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿ ٢٦ ﴾}'' اور تمہیں طیبات کا رزق دیا تاکہ تم شکر کرو۔''

یہ بات سمجھ لیجیے کہ مسلمانوں کو ہندوئوں کے غلبے سے بچانے کے لیے ایک شرطِ لازم یہ تھی کہ مسلمان ایک جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہوں' ورنہ ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں۔ کانگریس جیسی طاقت وَر اور منظّم جماعت ' اس کا سرمایہ' اس کے پیچھے تعلیم یافتہ لوگ' پھر انگریز کی حمایت ! ان حالات میں پاکستان کا حصول ممکن نہ تھا جب تک کہ مسلمان یک جان نہ ہو جاتے اور ان کی پوری قوت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے نہ آجاتی ! تحریک پاکستان کا اصل محرک اگرچہ یہی تھا کہ ہم ہندوئوں کے ثقافتی' مذہبی' لسانی' معاشی دبائو سے بچ جائیں لیکن پھر بھی مسلمانوں کو یکجا کرنے کے لیے یہ نعرہ لگا :''پاکستان کا مطلب کیا؟لا الٰہ الا اللہ''۔یہ وہی بات ہے جو ابھی بیان ہوئی کہ حضور ﷺ کا قرض ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ایسا نہ کر دیں۔

یہی بات علّامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء کے خطبے میں کہی تھی کہ ''مجھے یہ یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ عرب دورِ ملوکیت میں اسلام کی تعلیمات پر جو پردے پڑ گئے ہیں انہیں ہٹا کر دنیا کو اسلام کا اصل چہرہ دکھا سکیں''۔ ہندوستان نے تو مغلوں' خلجیوں' افغانوں' لودھیوں کی حکومتیں دیکھی ہیں' خلافت راشدہ تو نہیں دیکھی۔ ہم چاہتے تھے کہ پاکستان میں خلافتِ راشدہ کا نظام قائم ہو۔ قائد اعظم نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ پھر نہایت خلوص کے ساتھ دعائیں بھی مانگی گئی تھیں۔ میری

عمر کے افراد کو بخوبی یاد ہو گا کہ ہم نے نعرے لگائے' گڑگڑا کر دعائیں مانگیں کہ اے اللہ ! تُو ہمیں یہ ملک دے دے تاکہ ہم تیرے دین کا بول بالا کریں۔

بدعہدی کی سزا

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اس عہد کی خلاف ورزی کی ہے ۔عرب اور خلیجی ممالک میں آج ستائیسویں شب ہے۔ خلیج ہی کے دہانے پر پاکستان واقع ہے۔ پاکستان کے قیام کو باون برس ہو گئے' اس میں ہم نے کتنا اسلام نافذ کیا ہے؟کہاں ہیں وہ اصولِ حریت و اخوت و مساوات؟ آج بھی وہی سودی نظام' جاگیرداری نظام جاری ہے۔ علّامہ اقبال نے انقلاب کی دُوہائی دی تھی کہ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب ' انقلاب ' اے انقلاب !

سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں سے سرخ خون کشید کر کے شراب بنائی ہے جسے وہ شام کو بیٹھ کر پیتا ہے جبکہ زمیں دار اور جاگیردار انسانوں کے خون پسینے کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ انقلاب'انقلاب ! آج باون برس گزر گئے' انقلاب تو نہیں آیا۔ گویا ہم نے اللہ سے بدعہدی کی ہے اور ہمیں اس بدعہدی کی سزا مختلف صورتوں میں مل رہی ہے۔

---

۱)نفاق:اس بدعہدی کی سزا کے طور پر ہم پر نفاق مسلط کر دیا گیا۔ سورۃ التوبہ کی تین آیات میں منافقین کی ایک خاص قسم بیان فرمائی گئی ہے ۔{وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ عٰہَدَ اللّٰہَ} ''اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا''{لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِہٖ}''کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا '' غنی کر دے گا {لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۷۵﴾ } ''تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور بالکل نیک ہو جائیں گے''۔{فَلَمَّاۤ اٰتٰىہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ} ''لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا '' {بَخِلُوۡا بِہٖ وَتَوَّلَّوۡا}''تو انہوں نے بخل سے کام لیا اور پیٹھ موڑ لی'' {وَّ ہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۶﴾ }''اور اعراض کی روش اختیار کی۔''نتیجہ یہ نکلا: {فَاَعۡقَبَہُمۡ نِفَاقًا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ....}''تو اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا....''

منافقین کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے : {اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ} (النساء:۱۴۵) ''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔''سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا کہ اگر پورے دین پر کاربند نہیں ہوگے تو قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائو گے{وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ}۔ منافقین

کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا : {اِسْتَغْفِرْ لَہُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَہُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَہُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَہُمْ ط} (التوبۃ:۸۰) ''اے نبی ﷺ ! آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں (برابر ہے)۔ اگر آپ ان کے لیے ستّر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔''

اس نفاق کی تین شکلیں ہیں۔ پہلی نفاقِ باہمی 'یعنی قوم اب ایک نہیں رہی۔ ع

''اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!''

وہ مختلف عصبیتوں میں تحلیل ہو گئی۔ لسانی عصبیت' علاقائی عصبیت' گروہی عصبیت۔ یہ نفاقِ باہمی کی صورتیں ہیں۔ دوسری شکل نفاقِ عملی' یعنی کردار میں نفاق۔ اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں:جب بولے تو جھوٹ بولے 'جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور

جب امین بنا دیا جائے تو خیانت کرے''۔یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''اگر یہ تینوں نشانیاں موجودہوں تو وہ کٹر منافق ہے چاہے وہ نماز پڑھتا ہو' روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو''۔اپنے موجودہ معاشرے کو دیکھ کر تو مَیں یہ سمجھتا ہوں جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی بڑا جھوٹا' اتنا ہی بڑا وعدہ خلاف اور اتنا ہی بڑا خائن ہے۔ اب تو اربوں کے معاملے ہوتے ہیں۔ خیانت کوئی سینکڑوں ہزاروں کی نہیں رہی۔ الا ماشاء اللہ!

تیسری اور سب سے بڑی منافقت ہمارے دستور کی ہے۔ قراردادِ مقاصد میں اللہ کی حاکمیت بھی ہے اور اسی میں غیر اسلامی چیزیں بھی ہیں۔ دستور کے اندر اگرچہ یہ دفعہ بھی موجود ہے کہ کوئی قانون سازی کتاب و سُنّت کے منافی نہیں کی جا سکتی لیکن وہ operativeنہیں ہے۔اسلامی نظریاتی کونسل دیکھتی رہے گی او رہر سال رپورٹیں پیش کرتی رہے گی۔ رپورٹوں کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ ان پر یقینی طور پر عمل درآمد ہو گا یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے فیڈرل شریعت کورٹ تو بنائی لیکن ساتھ ہی اسے دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں بھی پہنا دیں۔ دستورِ پاکستان بھی اس کے دائرے سے خارج' جوڈیشل قوانین بھی اس کے دائرے سے خارج 'فیملی لاز بھی اس کے دائرے سے خارج اور مالی قوانین بھی اس کے دائرے سے دس سال کے لیے خارج۔ نفاذِ اسلام کے معاملے میں اس سے بڑا مکروفریب اور دھوکا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اب اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ موجودہ طرز کی مذہبی دہشت گردی کون لوگ کر رہے ہیں؟ چاہے وہ بیرونی دشمنوں کے آلہ کار ہوں مگر باہر والا خود آ کر تو نہیں کر رہا' کر تو یہاں کے لوگ ہی رہے ہیں ۔ وہ ''را'' کے ایجنٹ ہوں' موساد کے ہوں یا کوئی بھی ہوں' اگر ہمارے ہاں یہ مذہبی تلخی نہ ہو تو انہیں یہ coverکیسے مل جائے گا

! سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تین قسم کے عذاب گنوائے ہیں:
{قُلۡ ہُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ}

''کہہ دیجیے (اے نبی ﷺ) کہ اللہ اس پر قادر ہے' کوئی عذاب تمہارے سروں کے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے (زمین پھٹ جائے' زلزلہ آ جائے) یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھائے۔''

یہ تیسرے درجے کا بدترین عذاب ہے جس کا آج ہم سب شکار ہیں۔

۲) معاشی بدحالی: مزید برآں یہ بھی خدائی عذاب کا مظہر ہے کہ معاشی اعتبار سے ملک تباہ ہو چکا ہے۔ کوئی حکومت خواہ کسی کی بھی ہو' وہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے کسی حکم کو ماننے سے انکار کر ہی نہیں سکتی۔ کسی ایک کی مدد آنے میں دیر ہو جائے تو حکومت کی جان پر بن جاتی ہے۔ ہم بالکل دیوالیہ ہو گئے ہیں۔ جب تک ہم ان کی پوری پالیسی کو فالو کرتے رہیں گے' وہ قسط دیتے رہیں گے۔ گویا ہیروئن کی dose ہمیں ملتی رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ جتنی dose ہمیں مل رہی ہے ' اس سے ہماری معیشت کا بیڑا مزید غرق ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ادھر سے ایک نئی دجّالی لہر بھی شروع ہو چکی ہے جس کی خبر احادیث میں دی گئی تھی۔ دجّال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چند مہینے میں پوری دنیا میں پھر جائے گا۔ رزق کے خزانوں پر اس کا اتنا قبضہ ہو جائے گا کہ جو کفر کرے گا ' صرف اُسی کو دے گا' باقی کسی کو نہیں۔ سٹاک ایکسچینج میں مندی اور کرنسی کی قدر میں کمی اسی معاشی بدحالی کے آثار ہیں۔ اسے مشرقِ بعید سے پاکستان تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی ! اگر روس جو خلا میں سب سے پہلے پہنچا تھا ' وہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ڈبل روٹی نہیں مل رہی تھی' تو ہم کس شمار میں ہیں۔ مَیں نے روس کی ایک بوڑھی عورت کا فوٹو دیکھا تھا کہ شدید ترین سردی میں اپنا سویٹر ایک مچھلی لینے کے لیے دے رہی ہے۔

ہمارا جو حال ہو گا' اسے سورۂ سبا کی آیت کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: {لَقَدۡ کَانَ لِسَبَاٍ فِیۡ مَسۡکَنِہِمۡ اٰیَۃٌ ۚ}''قومِ سبا کے لیے اُن کے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی''{جَنَّتٰنِ عَنۡ یَّمِیۡنٍ وَّ شِمَالٍ ؕ} ''دو باغات تھے دائیں اور بائیں طرف''۔ ہم نے ان کو دو وسیع و عریض جنتیں دی تھیں۔ پاکستان بھی دو جنتوں پر مشتمل تھا: مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ {کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ

بَلۡدَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَّ رَبٌّ غَفُوۡرٌ ﴿۱۵﴾} ''کھاؤ اپنے ربّ کے رزق میں سے اور اُس کا شکر بجا لاؤ۔ ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔'' پاکستان بننے کے بعد یہاں خوش حالی تھی۔ پاکستان سے جیسے ہی کوئی شخص

ہندوستان میں داخل ہوتا تھا تو کہتا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم ایک ترقی یافتہ ملک سے کسی دقیانوسی ملک میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس کے برعکس وہاں سے جو پاکستان میں آتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ہم کسی مغربی ملک میں آ گئے ہیں۔ {فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ وَ بَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّ اَثۡلٍ وَّ شَىۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ ﴿۱۶﴾} ''مگر انہوں نے اعراض کیا' تو ہم نے اُن پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے دو باغوں (کو برباد کر کے ان) کی جگہ دو اور باغ انہیں دیے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔'' {ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا‌ؕ} ''یہ بدلہ تھا جو ہم نے ان کو دیا اُس ناشکری کا جو انہوں نے کی تھی''۔ {وَهَلۡ نُجٰزِىۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾} ''اور ایسا بدلہ ہم اُن کے سوا کسی اور کو نہیں دیتے جو انتہائی ناشکرے ہو۔''

۳) ملکی سالمیت کو خطرہ: اس سے آگے یہ کہ ملک کے حصے بخرے ہونے کا شدید اندیشہ اب پھر اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ عدلیہ کے بحران میں چیف جسٹس بھی سندھی اور الیکشن کمیشن کا چیئرمین بھی سندھی۔ اب صدر بھی سندھی' وزیر اعظم بھی سندھی۔ کوئی چمک ہے یا کوئی دمک ہے یا کوئی طاقت ہے' کوئی پشت پناہی ہے' کوئی بہت بڑی شے یہ ساری چیزیں ہضم کروا رہی ہے' ورنہ اس ملک میں یہ چیزیں اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے لیڈر کہہ رہے ہیں کہ کوئی ایجنڈا ہے جس کو پورا کرنے کے لیے یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ مَیں نے حالیہ اجتماعِ جمعہ میں کہا ہے کہ اب تو ''جناح پور'' کے لیے بھی آثار نظر آ رہے ہیں۔ قومِ سبا کے لیے قرآن مجید میں آخری الفاظ یہ آئے ہیں: {فَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ وَ مَزَّقۡنٰهُمۡ كُلَّ مُمَزَّقٍ‌ؕ} ''آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا۔'' ہم نے انہیں بس کہانیاں بنا دیا کہ کبھی ایک قوم ہوتی تھی' اس کی بڑی عظمت تھی' بڑا طنطنہ اور دبدبہ تھا' اسے ٹکڑے کر کے ختم کر دیا۔

اس (بیسویں) صدی میں دو عظیم مملکتیں نسیاً منسیاً ہو گئی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عظیم سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ پھر روس کی ریاست مختلف ملکوں میں تقسیم ہو گئی۔ اب طالب علم ڈھونڈا کریں گے کہ کہاں ہوتا تھا وہ USSR! زمین وہیں رہتی ہے' اس کی شناخت اور پہچان بدل جاتی ہے۔ یہ امر توجّہ طلب ہے کہ اب عالمی سیاست کے حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ بے نظیر بھٹو اپوزیشن میں ہے اور زخم خوردہ بھی ہے لیکن جو باتیں وہ سیاسی انداز کی کرتی ہے' وہ قابلِ غور ہیں۔ اس کی تائید میں دوسرے سیاسی لوگ' جیسا کہ قاضی حسین احمد صاحب' بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے ہو رہا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان کو پوری طرح بھارت کے تابع کر کے اس کی علیحدہ حیثیت ختم کر دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں اب بھارت ہی ایسا ملک رہ گیا ہے کہ جس کو وہ چین کے خلاف اُبھار سکتا ہے۔ امریکہ کے لیے ''نیو ورلڈ آرڈر'' میں چین ایک بہت بڑے کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اسی تناظر میں اب بھارت میں ''بی جے پی'' اُبھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس کا

دوٹوک اعلانیہ موقف اور اوّلین ہدف یہ ہے کہ ''ہندوستان'' کی تقسیم (partition) کو کالعدم قرار دیا جائے۔ اس وقت ان کی گائو ماتا کے ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں۔ ان کے ہاں مذہبیت اور ہے کیا ! ان کا کوئی نظام نہیں' کوئی قانون نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی روایات ہیں' تہذیب ہے۔ تقسیمِ ہند کو وہ قطعاً تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ اب اپنے ہدف کے لیے فضا ہموار ہو رہی ہے۔

تصویر کا روشن رُخ

یہ تو مَیں نے قرآن اور سُنّت کے مختلف حوالوں سے اس وقت پاکستان کی خصوصی حیثیت بیان کی ہے۔ اسی معاملے کو چند اور پہلوئوں سے بھی دیکھ لیجیے۔ تصویر کا دوسرا اور روشن رُخ یہ ہے کہ چار سو سال کی تجدیدی مساعی ہماری پشت پر ہے۔ پہلے ایک ہزار سال تک سارے مجددینِ اُمّت عالمِ عرب میں پیدا ہوئے۔ جبکہ گیارہویں سے چودھویں صدی تک تمام مجددینِ اُمّت ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ مجدد الف ثانی (دوسرے ہزار سالہ مجدد) شیخ احمد سرہندی' بارہویں صدی کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی'

تیرہویں صدی کے مجدد اعظم سیّد احمد بریلوی' چودھویں صدی کے مجدد اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے علاوہ عظیم شخصیات علاّمہ اقبال' مولانا مودودی اور مولانا الیاس رحمہم اللہ کے برابر کی شخصیات پوری دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ ایک اعتبار سے ہمارے کندھوں پر ماضی کا ایک قرض ہے' اَسلاف کی طرف سے ایک ذمہ داری ہے۔ ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی اور الجزائر کے مالک بن نبی نے اپنی کتابوں میں واضح طور پر لکھا ہے :

Intellectual & Spiritual centre of gravity of the world of Islam has been shifted to "South Asia":

ایک زمانے میں علم کا مرکز بغداد ہوتا تھا۔ پھر یہ اعزاز ہسپانیہ کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد علم کا مرکز شمالی افریقہ بنا' جہاں ابن خلدون جیسی شخصیات اُبھری ہیں۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا علمی اور روحانی مرکز جنوبی ایشیا ہے۔

پھر یہ کہ بھارتی مسلمانوں نے پاکستان بنانے کے لیے ایک طرح سے اپنا فرضِ کفایہ ادا کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ جس علاقے میں وہ رہ رہے ہیں' وہاں تو پاکستان نہیں بنے گا۔ پھر بھی انہوں نے کس لیے تحریک پاکستان میں حصّہ لیا؟ صرف اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے ! اس حوالے سے اُن کی ذمہ داری کا بوجھ بھی ہمارے کندھوں پر ہے۔ وہاں پر وہ نہایت مشکلات جھیل رہے ہیں۔ معاشی طور پر پست ہیں۔ انہیں ملازمتیں نہیں ملتیں۔ تعلیم گاہوں میں ان کو داخلے نہیں ملتے۔ ان کی زبان ختم کر دی گئی ہے۔ اب تو دو نسلیں بیت گئیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس لیے برداشت کیا کہ (بقولِ فیض) ؎

جو ہم پہ گزری، سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

انہیں یہ نعرے سننے پڑتے ہیں ''مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان!'' نکلو یہاں سے۔ تم یہاں پر ہو کیوں! بال ٹھاکرے بہت کچھ کہتا رہتا ہے، وشوا ہندو پریشد کے لیڈر بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔بی جے پی والے اپنے بیانات کے اندر وقتی طور پر کچھ mild ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ بھارت کو ذرا اطمینان دلا کر پہلے اطراف کے دونوں مسلمان ممالک کے ساتھ نمٹ لیں۔ حسینہ واجد کے برسرِاقتدار آنے کے بعد بنگلہ دیش تو

پوری طرح بھارت کے زیر اثر آگیا ہے۔ وہاں ''را'' کا جال بچھا ہوا ہے۔ مَیں ابھی وہاں سے ہو کر آیا ہوں۔ خوف کی یہ کیفیت ہے کہ کچھ بتاتے ہوئے ساتھ یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ کہیں میرا نام نہ بتا دیجیے گا۔ دنیا کو یہ دکھایا جا رہا ہے کہ ہم نے فرخا بند کا معاملہ طے کر لیا ہے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ وہاں پانی ہے ہی نہیں۔ یہ وہ بنگال ہی نہیں جو مَیں نے ۱۹۶۸ء میں دیکھا تھا۔ اُس وقت وہاں ہر طرف سرسبزی اور شادابی تھی، ذرائع آب کی فراوانی تھی۔ اب وہاں ندی نالے اور دریا سوکھے پڑے ہیں۔

پاکستان کی خصوصی اہمیت

ایک اس پہلو پر بھی مَیں توجّہ دلانا چاہتا ہوں کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی کچھ پیشین گوئیاں ہیں جن میں اس خطے کے کردار کا بھی ذکر ہے۔ ایک پیشین گوئی قرآن سے بھی ثابت ہے کہ تین مرتبہ فرمایا کہ اپنے رسول ﷺ کو ہم نے دین کے غلبے کے لیے بھیجا ہے اور پانچ مرتبہ فرمایا کہ تمام انسانوں کے لیے بھیجا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد پورا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ پورے عالم انسانی پر دین قائم نہ ہو جائے۔ بقولِ اقبال ؎

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

حضور ﷺ نے خبر دی ہے کہ دنیا کے خاتمے سے پہلے کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو گا اور اس عمل میں خراسان کا علاقہ اور عرب کے مشرقی ممالک اہم کردار ادا کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس علاقے میں افغانستان ''خراسان'' پر مشتمل ہے جبکہ اس کا ایک حصّہ پاکستان میں بھی شامل ہے۔ یہاں سے فوجیں جائیں گی

اور یروشلم جو ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے‘ اسے بازیاب کرائیں گی۔ عربوں میں تو دَم نہیں ہے۔ ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر کے عربوں ہی سے یروشلم چھینا تھا۔ اس کے بعد ۸۸ برس تک وہ ان کے قبضے میں رہا ہے‘ عرب واپس نہیں لے سکے۔ آخر کار کرد خون صلاح الدین ایوبی نے اسے فتح کیا۔ اب پھر انہوں نے عربوں سے چھینا ہے۔

عرب قوم کو ان کی عیاشیوں اور دولت کی فراوانی نے کھوکھلا کر دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ خراسان کی طرف سے سیاہ جھنڈے آئیں گے‘ انہیں کوئی روک نہیں سکے گا جب تک کہ ایلیا میں جا کر نصب نہ ہو جائیں۔ یوں اس میں پاکستان کا بھی ایک کردار بنتا ہے ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے‘ میرا وطن وہی ہے!

مَیں نے ابتدا میں تین پہلوئوں سے ایک مسلمان کے ماورائے زمان و مکاں فرائض بیان کیے ہیں‘ یعنی اللہ کے حقوق‘ رسول اللہ ﷺ کے حقوق اور انسانوں کے حقوق۔ اس کے بعد تین ہی اعتبارات سے پاکستان کی خصوصی اہمیت کے حوالے سے بات کی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس ملک کے genesis کی بنیاد کیا تھی‘ قرآن میں اس کا بھی ذکر موجود ہے ۔ آج ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں‘ منافقت کی تین صورتوں کے حوالے سے قرآن میں اس کا بھی ذکر ہے۔ جو معاشی بدحالی ہمارے ہاں آچکی ہے‘ سورۂ سبا میں اس کا بھی ذکر ہے۔ پھر جو اندیشے ہیں: {فَجَعَلْنٰہُمْ اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰہُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ} کہ بس کہانیاں رہ جائیں گی کبھی ایک ملک بنا تھا‘ قائم ہوا تھا‘ اس کا اشارہ بھی موجود ہے۔ گویا پاکستان بالفاظِ قرآنی ’’فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ‘‘ (الانبیاء:۱۰) کا مصداقِ کامل ہے۔ اب بین الاقوامی ادارے تو کہتے ہیں کہ یہ سب بڑی جلدی ہو جائے گا۔ پچھلے دنوں امریکی محکمہ خارجہ کی رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ اتنے سالوں بعد پاکستان نام کا کوئی ملک دنیا میں نہیں ہو گا۔

چند مثبت پہلو

اب مَیں چاہتا ہوں کہ کچھ مثبت پہلوئوں کی نشان دہی کروں۔ آیا ہمارے پاس کچھ assets بھی ہیں یا نہیں؟

پہلی بات یہ ہے کہ چاہے حالات کیسے ہی ہوں‘ پاکستان کے دستور میں اتنا اسلام آگیا ہے کہ اگرچہ اُس کی تکمیل بہت مشکل ہے لیکن اتنے حصے کو بھی دستور سے نکال دینا کسی مائی کے لال کے لیے ممکن نہیں ہے۔ قراردادِ مقاصد میں اللہ کی حاکمیت کا اقرار ہے۔ گویا نظامِ خلافت اصولاً دستوری طور پر پاکستان میں نافذ ہو چکا ہے۔ اس کی مثال

ایسے ہی ہے کہ چاہے مَیں اسلام پر عمل نہیں کر رہا لیکن بہرحال مسلمان ہوں‘ اسی طرح سے پاکستان ایک مسلمان ملک بن گیا جب اُس نے کہا کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور ہم اپنے اختیارات ایک امانت سمجھ کر حاکم مطلق کی عائد کردہ حدود کے اندر استعمال کریں گے۔ یہ گویا دستوری سطح پر ’’لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ‘‘ اور ’’اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ‘‘ کا اقرار ہے۔

دوسرا ایک بہت بڑا asset یہ ہے کہ بہت سی تحریکوں اور علّامہ اقبال‘ مولانا مودودی جیسے مفکرین اور مصنّفین کی مساعی سے پاکستان میں ہر عمر کے افراد کی ایک بڑی تعداد دین کے جامع تصوّر سے روشناس ہو چکی ہے۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام دین ہے‘ مذہب نہیں۔ یہ انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے ۔ وہ دور گزر گیا جب سمجھا جاتا تھا کہ صرف نماز‘ روزہ ہی دین ہے۔ عبادت کا مطلب صرف نماز‘ روزہ نہیں بلکہ پوری زندگی میں اللہ کی بندگی ہے۔ علّامہ اقبال نے یہ بھی تصوّر دیا تھا کہ ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا !

اور ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری !

اور ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی !''
علّامہ اقبال کا پیغام دین و دنیا کی وحدت تھا اور وہ دنیا کو دین کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اب بہت سے لوگ یہ اُمنگ رکھتے ہیں۔ ان میں خواہش بھی ہے، جذبہ بھی ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ ایک تو اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے بٹے ہوئے ہیں۔ اصل مقصد کو نظر انداز کر کے اپنی پارٹی اور شخصیت کو اُبھارنے کی فکر ہے۔ ایک خلط مبحث تھا کہ یہاں دین کیسے لائیں ! غلطی سے یہ سمجھا گیا کہ الیکشن میں حصّہ لو۔ ووٹ مل جائیں گے تو اسلام نافذ کر دیں گے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس نقطہ نظر میں اب بہت حد تک کمی ہو گئی ہے۔ تقریباً تمام مذہبی جماعتیں یہ سمجھ چکی ہیں کہ الیکشن کے ذریعے سے یہاں اسلام نہیں آسکتا۔

تیسرے یہ کہ الحمد للہ ایک عظیم قرآن تحریک اس ملک میں قائم ہوئی ہے اور چلی ہے۔ کیا کسی نے کبھی سنا تھا کہ لوگ نماز تراویح کے لیے چھ چھ گھنٹے کسی مسجد میں موجود رہے ہیں؟ پورے قرآن کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ سات سات سو آدمی جمع ہیں اور کوئی سیاسی نعرہ نہیں، کوئی اختلافی بات نہیں۔ ساری توجّہ بس اسی پر ہے کہ قرآن کو سمجھا جائے۔

ہندوستان میں یہ تحریک شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شروع کی تھی۔ انہوں نے ''الفوز الکبیر'' لکھی۔ فارسی میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ ان کے دو بیٹوں نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس سے پہلے لوگ قرآن کا ترجمہ کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ آج بھی بعض لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ ایک بہت بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ بس قرآن پڑھو اور ثواب حاصل کرو۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو کسی عالم دین سے پوچھ لو۔ ترجمہ پڑھنے سے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہوجاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جب قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا تو انہیں قتل کرنے کی سازش تیار کی گئی۔ اس مقصد کے لیے سرحد کے علاقے سے پٹھان بلا لیے گئے تھے۔ شاہ صاحبؒ دہلی کے چاندنی چوک کے ایک سرے پر واقع مسجد فتح پور میں درسِ حدیث دیتے تھے۔ عصر کے بعد درس کے اختتام پر وہ مسجد سے نکل رہے تھے تو باہر قتل کرنے کے لیے افراد کھڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت اُن کے دل پر اللہ نے ایسی ہیبت ڈال دی کہ وہ حملہ نہیں کر سکے۔ بہرحال شاہ صاحبؒ نے قرآن کو ایک کھلی کتاب کے طور پر متعارف کرایا کہ اسے پڑھو اور سمجھو !

اگر یہ ملک نہ بنتا تو شاید ایسی تحریک یہاں نظر نہ آسکتی۔ الحمد للہ، ہمیں مواقع ملے ہیں۔ اللہ نے سہولتیں دی ہیں۔ کئی مہینے تک ہر ہفتے ''الہدیٰ'' کا پروگرام پورے ملک میں نیشنل hook up (قومی نشریاتی رابطہ) پر ایک ہی وقت میں ٹیلی کاسٹ ہوا ہے۔ اسلام کا، قرآن مجید کا ایک غلغلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس ملکِ میں مغربیت کے

پرستاروں کو فکر لاحق ہو گئی کہ یہ طوفان تو ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ پھر انہوں نے جو کچھ بھی کیا' وہ سب کو معلوم ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میری دعوت آڈیوز میں' ویڈیوز میں پھیل رہی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو پڑھنے والے موجود ہیں' وہ ہماری تحریک سے واقف

ہیں۔ اب تین چار سال سے امریکہ جاتا ہوں تو وہاں انگریزی میں لیکچر دیتا ہوں۔ الحمد للہ' وہاں ہمارا پورا پیغام انگریزی میں جا چکا ہے۔ امریکہ میں موجود عربوں کو بھی اور وہاں کی افریقی نژاد آبادی کو بھی۔ پھر وہاں سے ہو کر مختلف مقامات پر یہ پیغام جا چکا ہے ۔ امریکہ تو ایک مرکز ہے' اس وقت وہاں سے جہاں جہاں وہ چیز پہنچ رہی ہے تو اس کا کوئی نتیجہ ان شاء اللہ نکلے گا۔ اس کا منبع اللہ نے اس ملک کو بنایا ہے۔

یہ وہ assets ہیں جو ہمارے پاس ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں شعور ہونا چاہیے۔ اس کے بعد معاملہ یہ ہے کہ عملی اقدامات کیا ہونے چاہئیں !

پس چہ باید کرد

پہلے قدم کے طور پر اس شعور کو اُجاگر کیا جائے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدّوجُہد فرضِ عین ہے۔ اس حوالے سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ اسے مَیں نے واضح طو رپر بیان کر دیا ہے۔ اگر دین قائم نہیں ہے تو ہماری عبادت جزوی ہے۔ زندگی کے ایک حصے میں ہم اللہ کی عبادت کر رہے ہیں جبکہ ہماری زندگی کے دوسرے پہلو اللہ کی بغاوت پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ یہ کام فرضِ عین کے درجے میں ہے اوراس کے لیے عقلاً اور نقلاً لازم ہے کہ آدمی کسی جماعت میں شامل ہو۔ کوئی شخص اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔ انقلاب لانا یعنی نظام بدل دینا کسی ایک آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک پارٹی چاہیے' حزب اللہ چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کورا جواب دے دیا تھا تو معاملہ وہیں کا وہیں رک گیا۔ حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھیوں(رضوان اللہ علیہم اجمعین)نے ایک جماعت کی شکل میں' جہاں آپ ﷺ کا پسینہ گرا وہاں اپنے خون کی ندیاں بہا دیں تو اسلام قائم ہو گیا۔

اس حوالے سے احادیث بھی موجود ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ))(رواہ ابوداؤد والترمذی)''تم پر جماعت کا التزام ضروری ہے''۔مزید فرمایا:((یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ)) (رواہ الترمذی)''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اِنَّہٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ وَلَا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِاِمَارَۃٍ (رواہ الدارمی)''یقیناً جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے' اور امارت کے بغیر جماعت

نہیں ہے''۔ اور حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کو تو ہم نے بہت عام کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنِّیْ آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ)) ''اے مسلمانو! مَیں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے کر جا رہا ہوں مجھے اللہ نے ان کا حکم دیا ہے''((بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (رواہ الترمذی وابوداؤد) ''جماعت کا' سننے اور ماننے کا' ہجرت کا اور اللہ کے راستے میں جہاد کا''۔ یعنی جماعتی زندگی ہو اور جماعت بھی سمع و طاعت والی' جو مضبوط نظم و ضبط کی حامل ہو۔ یہ جماعت ہجرت اور جہاد کرے گی۔ اس جماعت کے خدوخال ہم نے قرآن مجید میں پڑھے ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں حزب اللہ کا یہ وصف بیان ہوا: {فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾} ''یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔'' سورۃ المجادلۃ میں ''حزب اللہ'' کے ساتھ ''حزب الشیطان'' کا بھی ذکر ہوا۔

اس حوالے سے مَیں صرف اپنی جماعت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کوئی بھی جماعت جو آپ کے فہم کے مطابق دین کے لیے صحیح کام کر رہی ہو' اس میں شامل ہوں۔ کوئی شخص بھی اس سے محروم نہ ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً))(صحیح البخاری) ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت''۔ میرا کوئی اُمتی بھی تبلیغ قرآن کے فریضے سے محروم نہ رہ جائے' ورنہ میرا اُمتی کیسے ہوا! باقی جو لوگ اپنی زندگی وقف کردیں' ان کے لیے فرمایا: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ))(صحیح البخاری) ''تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں''۔ اس مقصد کے لیے اپنی زندگی لگا دیں۔ چنانچہ کوئی بھی جماعت ہو جس پر آپ کا دل ٹھک جائے' اس میں شامل ہوجائیں۔ البتہ اُس میں یہ چار خصائص ہونا ضروری ہیں:

(۱) اس جماعت کو اعلانیہ طور پر یہ واضح کرنا چاہیے کہ اس کا مقصد اقامتِ دین ہے۔ کوئی جزوی بات' کوئی سماجی اصلاح نہیں۔ یہ سارے کام اچھے ہوتے ہیں' خدمتِ خلق بھی اچھی بات ہے' لیکن ہر شے کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ جماعت وہ ہونی چاہیے جس کا مقصود اللہ کے دین کا غلبہ ہو۔ اسے اقامتِ دین کہہ لیں' نظامِ

خلافت کا قیام کہہ لیں‘ حکومت الٰہیہ کا قیام کہہ لیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصطلاح استعمال کریں۔

(۲) اس جماعت کا نظم و ضبط کڑا ہونا چاہیے۔ وہ محض افراد کا ایک ہجوم نہ ہو‘ بلکہ ہر طرح سے منظّم ہو۔ ایک امیر سے اطاعت کے عہد میں بندھی ہو۔

(۳) اسے اپنا طریقہ کار صاف طور پر اور قطعیت کے ساتھ بیان کرنا چاہیے کہ ہم کس طرح سے یہ کام کرنا چاہتے ہیں! ایسے ہی مبہم سے نعرے لگانا اور لوگوں کو صرف وقتی جوش دلانے کا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو طریقہ کار وہ پیش کریں وہ سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ ہو‘ اس لیے کہ ایک مسلمان کے لیے نمونہ نبی اکرم ﷺ ہی ہیں۔ اس حوالے سے امام مالکؒ کا قول ہے: لَنْ یُصْلِحَ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِھَا اَوَّلُھَا ’’اس اُمّت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہوسکے گی مگر ٹھیک اُسی طریقے پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔

(۴) جتنا بھی ممکن ہو‘ اُس کی قیادت کو ٹھوک بجا کر دیکھ لیا جائے۔ کسی کے دل میں تو نہیں اُترا جا سکتا لیکن دیکھ لینا چاہیے کہ ان کے قول اور فعل میں تضاد تو نہیں ہے۔ ان کا خانگی نظام کیسا ہے؟ آیا گھر میں دین نافذ ہے یا نہیں؟ ان کی معاش شریعت کے دائرے میں ہے یا نہیں؟

ان چار پہلوئوں کی تحقیق پر جو بھی وقت لگے گا وہ جہاد میں شمار ہوگا‘ بشرطیکہ اسے سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے۔ اسے اپنی ذاتی ضرورت سمجھ کر اہمیت دی جائے اور اپنے فرض کے طور پر لیا جائے۔ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے‘ میرا کوئی بھی پل جماعت کے بغیر نہیں گزرنا چاہیے۔ اقامت ِدین کی جدّوجُہد فرضِ عین ہے اور اس کے لیے جماعت شرطِ لازم ہے‘ جیسے کہ نماز کے لیے وضو شرطِ لازم ہے۔ جمعہ کے روز مَیں نے جو عہد لیا ہے‘ اس سے کچھ لوگ پریشان بھی ہو گئے ہیں کہ ہم سے اچانک اتنا بڑا عہد لے لیا گیا۔ اس ضمن میں سمجھ لیجیے کہ اس میں الفاظ یہ ہیں کہ ’’ممکن حد تک مَیں اپنا جان‘ مال اور وقت اس کام میں لگائوں گا۔‘‘ مَیں نے کوئی حتمی معیار مقرر نہیں کیا ہے۔ ہر شخص ممکن حد تک اس کی کوشش

کرے‘جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :{فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ} (التغابن:۱۶) ’’پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حد اِمکان تک‘‘۔البتہ اسے یہ شعور ہو کہ ہمارے ملک کی بقا اور استحکام اسی میں ہے۔ یہ کشتی ڈوبتی ہے تو ہم ڈوبیں گے‘ یہ تیرتی ہے تو ہم منزل پر پہنچیں گے۔

خالص دنیاوی اعتبار سے بھی یہ غور و فکر کا مقام ہے۔ اللہ سے وعدہ خلافی کی کوئی اور سخت سزا نہ مل جائے ! مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایک بہت بڑی سزا تھی۔ مسلمان قوم کے ترانوے ہزار افراد اُس ہندو کے قیدی بنے جس پر مسلمانوں نے کہیں آٹھ سو برس‘ کہیں ہزار برس حکومت کی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح انہیں ٹرکوں میں لاد کر لے گئے‘ جیسے عید پر شہروں میں جانور ذبح ہونے کے لیے لائے جاتے ہیں۔ ہمارا ٹائیگر جرنیل دشمن جرنیل کو اپنا پستول پیش کر رہا ہے۔ گویا ’’یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّہُمۡ صٰغِرُوۡنَ‘‘ کا نقشہ ہے۔ اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ

We have avenged our thousand-year slavery

اور یہ کہ ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔ اب سونیا گاندھی بھی دوبارہ منظر پر آئی ہے اور اس نے بیان دیا ہے کہ پاکستان میں جس طرح بھارتی فلمیں دیکھی جاتی ہیں اور ان کے گانے سنے جاتے ہیں‘ ہم نے ثقافتی طور پر اسے colonize کر لیا ہے۔ کلچر پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا تو ہمارے پاس پھر رہ کیا گیا ہے ! چنانچہ ہر شخص اس کام میں لگے ۔ اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے۔اسے اس امر کا ادراک ہو کہ یہ میرے اللہ کا حق ہے مجھ پر‘ میرے رسولؐ کا حق ہے مجھ پر‘ پوری نوعِ انسانی کا حق ہے مجھ پر۔ میرے ملک کا حق ہے‘ میری ۴۰۰ برس کی تاریخ کا حق ہے۔ جو بھی خبریں محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی ہیں‘ ان سے بھی یہ جذبہ پیدا ہوجانا چاہیے کہ آپ ﷺ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے تن من دھن لگا دیا جائے۔ع ’’دے تُو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی !‘‘

مَیں نے کہا تو یہ ہے کہ آپ کوئی جماعت تلاش کریں لیکن اس کے بعد بھی انسان اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔ مسلسل غور و فکر کرتا رہے۔ ع ’’ہے جستجو کہ خوب سے ہے

خوب تر کہاں !‘‘البتہ آج شروع تو کر دے۔ کسی جماعت میںشریک ہو جائے۔ مَیں یہ بات بھی عرض کردوں کہ میرے نزدیک جماعت کی مسنون‘ منصوص اور ماثور بنیاد بیعت کا نظام ہے‘ لیکن یہ اگر نہ بھی ہو تو کوئی دستوری جماعت بھی مباح کے درجے میں ہے‘ بشرطیکہ اس کا ڈسپلن مضبوط ہو اور بلند اخلاقی معیار ہو۔

میرا مشن

مَیں نے ۱۹۶۵ء میں اپنے مشن کا آغاز کیا تھا‘ اب ۱۹۹۸ء آگیا ہے۔ ۳۳ سال تو پورے ہو ہی چکے ہیں۔ میرا پہلا کام دعوت رجوع الی القرآن تھا‘ جو آج تک چل رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جب مَیں نے کوئی اگلا قدم اٹھایا تو

اس کام کو چھوڑ دیا ہو۔ اپنی عمر کے ٦٦ویں برس میں مَیں نے جو ۲۵ دن یہاں مشقت جھیلی ہے' اس سے پہلے امریکہ میں بھی آدھا دورۂ ترجمہ قرآن انگریزی میں ریکارڈ کرا چکا ہوں۔ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب مکمل طور پر انگریزی میں ریکارڈ کرا چکا ہوں۔ بیس بیس گھنٹے کے پروگرام ایک ایک گھنٹے کی ٹیپ میں ریکارڈ کرائے ہیں۔ چھ گھنٹے کا پروگرام ایمان کی حقیقت کے بارے میں ہے۔ دو گھنٹے کا جہاد پر' دو گھنٹے کا نفاق پر' دو گھنٹے کا شرک پر اور آٹھ گھنٹے کا پروگرام خلافت کے حوالے سے ہے۔ اگر آج دنیا میں خلافت قائم ہو گی تو اس کا سیاسی' معاشرتی اور معاشی ڈھانچا کیسا ہو گا! یہ ویڈیوز اور آڈیوز میں دستیاب ہے۔

اس دعوت رجوع الی القرآن کے نتائج الحمد للہ بہت اچھے نکلے ہیں۔ انجمنیں قائم ہوئی ہیں۔ لاہور کی مرکزی انجمن' پھر کراچی' ملتان' فیصل آباد' راول پنڈی' پشاور کی انجمنیں۔ قرآن اکیڈمیز وجود میں آئی ہیں۔ پہلے لاہور کی اکیڈمی بنی' پھر کراچی میں۔ اب ملتان میں بھی بن چکی ہے۔ قرآن کانفرنسیں منعقد کی گئی ہیں۔ قرآنی تربیت گاہیں ایک ایک مہینے کی' چالیس چالیس دن کی' سات سات دن کی ہمہ وقت ہوئی ہیں۔ لاہور میں اتوار کو میرا جو عوامی درسِ قرآن ہوتا تھا' اس میں اوسطاً چھ سو آدمی شریک ہوتے تھے۔ دعوت رجوع الی القرآن کا بالواسطہ نتیجہ بھی بہت اچھا نکلا ہے کہ اب بہت سے ادارے قائم ہو گئے ہیں جہاں قرآن مجید کی دعوت دی جا رہی ہے۔ عربی زبان کی تدریس ہو رہی

ہے۔ ۲٦ برس پہلے ۱۹۷۲ء میں ہم نے ''قرآن کانفرنس'' جیسی جو اصطلاحات وضع کی تھیں' الحمد للہ وہ عام ہو گئی ہیں۔ اسی طریقے سے عربی زبان کی تدریس جو وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے اس کا بھی بالواسطہ طور پر ہمیں پھل ملے گا' اس لیے کہ یہ کاشت ہم نے شروع کی ہے۔ مَیں چاہوں گا کہ جو حضرات بھی جاننا چاہیں کہ کیا کچھ ہوا ہے' کس طور سے ہوا ہے' اس کا صغریٰ کبریٰ کیا ہے' اس کا پس منظر کیا ہے' وہ میری کتاب ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' کا مطالعہ کریں۔ اس ضمن میں یہاں پر خواتین کے پروگرام بھی ہو رہے ہیں۔ ایک سالہ (رجوع الی القرآن) کورس بھی شروع ہو رہا ہے۔ لاہور میں تو یہ مسلسل ہو رہا ہے ۔ امریکہ سے آکر لوگ وہاں شریک ہو رہے ہیں ۔ الحمد للہ ! اب امریکہ میں بھی ہماری اکیڈمی شروع ہو جائے گی۔

دوسرا کام جو 'الحمد للہ 'مَیں نے کیا ہے اللہ کے فضل و کرم سے وہ ایک مختصر لیکن منظّم تنظیم بیعت کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ ایک مُردہ سُنّت کو زندہ کیا ہے ۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن' حدیث' سُنّت' سیرت اور مسلمانوں کی ۱۴۰۰ برس کی تاریخ میں کسی اجتماعیت کی کوئی اور بنیاد ہے ہی نہیں سوائے بیعت کے۔ حضور ﷺ نے بیعت لی ہے۔ ایک بڑی طویل حدیث ہے جو بعد میں آپ کو سنائوں گا' ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کی بیعت وہیں سے لی ہے۔ اس پر ایک جماعت مرتّب کی ہے' ڈھانچا بنا دیا ہے' نظام العمل بنا دیا ہے۔

بیعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب کسی کو کچھ کہنے کا حق ہی نہیں ہے۔ لا حول ولا قوۃ! حضور ﷺ سے بھی لوگ اختلاف کر لیتے تھے۔ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیمپ یہاں لگا دو' لگا دیا گیا۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر تو یہ وحی سے ہے تو ٹھیک ہے' اگر آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہم کچھ عرض کریں۔ فرمایا: ہاں کہو۔ کہا کہ ہمارے جنگی تجربے کی رو سے کیمپ وہاں لگنا چاہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیمپ اُکھاڑو اور وہاں لگا دو۔ قرآن مجید میں حضور ﷺ کو حکم ہوا :{وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ} (آل عمران:۱۵۹) ''اور اُن سے مشورہ کرتے رہا کیجیے''۔چنانچہ مشورہ بھی ہو سکتا ہے' اختلافِ رائے بھی ہو سکتا ہے' ذاتی تنقید بھی ہو سکتی ہے۔ تنظیم اسلامی کا ایک سالانہ اجلاس

ایسا ہوتا ہے جس میں جو رفیق چاہے آئے اور مجھ پر ذاتی تنقید کرے۔ شوریٰ کا نظام اس کے علاوہ ہے جو منتخب افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔

ہم نے بیعت کے اصول پر جماعت بنا دی جو صرف پیری مریدی کا دھندا رہ گیا تھا۔ اسی لیے پہلے پہل لوگوں نے اسے استہزائیہ طور پر دیکھا۔ البتہ اب یہ جماعت الحمدللہ باقاعدہ ایک ادارہ ہے۔ اس کا ایک پورا نظام العمل ہے۔ تنظیم کی بنیادی دعوت کو سمجھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دس کتابچے ہیں۔جس کا بھی ارادہ ہو جائے کہ بات سمجھنی ہے' جہاں اور جماعتوں کو دیکھنا ہے اس کو بھی دیکھنا ہے' تو وہ ان کتابچوں کا مطالعہ کرے۔ ان میں عزمِ تنظیم ،تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر ،تعارفِ تنظیم ،تنظیم کا نظام العمل شامل ہیں۔ پھر میرا ذاتی حساب کتاب کہ مَیں نے دنیا میں کتنی جائیداد بنائی ہے' میرا ذریعہ آمدن کیا ہے' کب شروع کیا تھا' اس کے بعد سے اب کیا صورت حال ہے' ایک ایک پیسے کی تفصیل ''حسابِ کم و بیش'' نامی کتاب میں موجود ہے۔ یہ ساری چیزیں ان لوگوں کے لیے ہیں جنہیں یہ شعور حاصل ہو گیا ہو کہ مجھے اللہ کی بندگی کرنی ہے' جس کے لیے یہ کام لازم ہے۔ مجھے حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا قرض ادا کرنا ہے' جس کے لیے یہ لازم ہے۔ مجھے اس ملک کا حق ادا کرنا ہے' جس کے لیے یہ لازم ہے۔ اگر کسی کو اپنے فرض کا ادراک ہو جائے گا تو وہ تلاش کرے گا' اور جو تلاش کرے گا وہ پائے گا' ان شاء اللہ !

میرا ایک ماضی بھی ہے ۔ مَیں جماعت اسلامی میں رہا ہوں تین برس اور اس سے قبل سات برس اسلامی جمعیت طلبہ میں۔ جمعیت کا مَیں آل پاکستان ناظم اعلیٰ بھی رہا ہوں جبکہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہی ملک تھے۔ جماعت اسلامی میں ضلع منٹگمری کا امیر رہا ہوں۔ پھر جماعت اسلامی سے مجھے اختلاف ہوا۔ کیوں ہوا تھا' اس پر میری پوری کتاب موجود ہے۔ بدنیتی کا کوئی الزام مَیں نے مولانا مودودی مرحوم پر نہیں لگایا۔ اختلاف اس امر پر ہوا تھا کہ حالات نے ثابت کر دیا کہ جماعت کا انتخابات میں حصّہ لینا ایک سعی لاحاصل تھا۔ ہمیں انقلابی طریقہ کار

اختیار کرنا چاہیے۔ ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' مَیں نے ۲۵ برس کی عمر میں لکھی تھی اور اُس وقت مَیں جماعت کا رکن تھا۔

ایک طرح سے وہ پارٹی ورکرز کی طرف سے note of dissent تھا۔ مَیں نے اپنی رائے پیش کی ' لیکن اسے صحیح تناظر میں نہیں دیکھا گیا۔ اس اختلاف کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب' مولانا عبدالغفار حسن صاحب' عبدالجبار غازی صاحب' حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب' شیخ سلطان احمد صاحب اور مولانا افتخار احمد بلخی صاحب جیسے اکابر جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ حادثہ کیوں ہوا' اس پر بھی میری ایک کتاب ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گم شدہ باب'' موجود ہے۔ میرے بارے میں بہت پروپیگنڈے کر دیے گئے ہیں' جن کی وجہ سے حجابات سے قائم ہو چکے ہیں۔ جنہیں میرے اُس ماضی کو دیکھنا ہو وہ ان کتب کا مطالعہ کریں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

تیسرا کام جس کا الحمد للہ میں اللہ کا اپنے اوپر بڑا فضل و کرم مانتے ہوئے تذکرہ کر رہا ہوں' اسے کسی درجے میں بھی خود ستائی سمجھنے کے بجائے{وَ اَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾}(الضحیٰ)''اور اپنے رب کی نعمت کا بیان کریں!'' کا مصداق گردانیے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ہم نے ایک پراسس اخذ کر کے اسے ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کی صورت میں واضح کر دیا ہے۔ مَیں آپ سب سے کہوں گا کہ اس کا مطالعہ کیجیے۔ سمجھ میں نہ آئے تو اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیجیے' کسی جگہ اختلاف ہو تو مجھ سے آکر بات کیجیے۔ ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' کے نام سے کتاب بھی ہے' آڈیوز بھی ہیں' ویڈیوز بھی ہیں۔

چوتھے درجے میں ہم نے ۱۹۹۱ء میں ''تحریکِ خلافت'' شروع کی تھی۔ کراچی میں چار دن 'خالق دینا ہال' میں خلافت کے موضوع پر لیکچر دیے۔ اس کے بعد اگرچہ پروگرام تو یہ تھا کہ اسے ایک عوامی موومنٹ کے طور پر چلایا جائے لیکن پھر ہم نے محسوس کیا کہ لوگ ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ فارم تو پُر کر دیتے ہیں لیکن اس کے بعد انہیں ڈھونڈیے تو ملیں گے نہیں۔ لہٰذا ہم نے اسے ابھی محدود کر دیا ہے کہ جو بیعت نہ کرنا چاہیں وہ معاونِ تحریک خلافت بن جائیں۔ ''تحریکِ خلافت پاکستان'' ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے تاکہ خلافت سے متعلق تمام مواد لوگوں کو پہنچایا جائے اور نظامِ خلافت کے خدوخال کو واضح کیا جائے۔

مَیں نے اپنے ان ''خطباتِ خلافت'' کا فارسی میں ترجمہ کرایا ہے۔ ان کی خاص طور پر ایران اور افغانستان میں اس وقت شدت کے ساتھ ضرورت ہے تاکہ انہیں معلوم ہو۔ وہ حکومت تبدیل تو کر بیٹھے ہیں لیکن اب انہیں سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے چلائیں کیسے۔ ایران میں صدر خامنائی اور ان کے راہبر کے درمیان اختلاف ہے' جو سڑکوں پر آ

کیا ہے۔ یہ dualism چل نہیں سکتا۔ ایک طرف صدر منتخب ہو کر آ رہا ہے ' دوسری طرف مذہبی پیشوا بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے میں اسلامی خلافت کا نظام کیسے قائم ہو گا ! مَیں پچھلے سال ایران گیا تھا ۔ وہاں کے علماء سے گفتگو ہوئی تو وہ confused نظر آئے۔ افغانستان کے ہمارے ساتھیوں کی تو اکثریت جدید تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ انہوں نے تو محض اپنے جذبۂ ایمانی اور حالات کے جبر کے تحت یہ سب کچھ کیا ہے۔ طالبان کے پاس اگرچہ ایک بڑا علاقہ ہے لیکن انہیں بھی اب یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلامی نظام کیسے چلے گا۔ موجودہ حالات میں ایک جدید ریاست میں خلافت کا نظام کیا ہوگا۔ خلافت اصولی طور پر کیا تھی؟ خلافت حضور ﷺ کے دور میں کیا تھی؟ اور خلافت اب کیا ہو گی؟ ان تمام امور کو دلیل کے ساتھ سمجھنا ہے۔

میری فکر کے منابع

''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' میں مَیں نے اپنی فکر اور سوچ کے چار ذرائع (sources) معیّن کیے ہیں۔ میری فکر پر سب سے پہلا اثر علاّمہ اقبال کی ملی شاعری کا ہے' جو سب سے مضبوط بھی ہے۔ اسی میں ان کا فلسفیانہ فکر بھی شامل ہے جو The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں بیان ہوا۔ اس کے بعد مولانا مودودیؒ کا تحریکی فکر ہے۔ علاّمہ اقبال ایک مفکر تھے' وہ تحریک چلانے والے آدمی نہیں تھے۔ البتہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اپنے انتقال سے دو سال پہلے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ علاّمہ اقبال عمر کے آخری حصے میں بیعت کی بنیاد پر ایک ''جمعیت شبان المسلمین'' قائم کرنا چاہتے تھے ' جس کا دستور بھی مرتّب ہو گیا تھا۔ اس کتاب کی تلخیص کر کے ہم نے ''علاّمہ اقبال کی آخری خواہش'' کے عنوان سے شائع کی

ہے۔ اس میں ساری خط و کتابت اور ریکارڈ موجود ہے۔ بہرحال وہ اپنی زندگی میں یہ کام نہیں کر سکے۔ یہ کام مولانا مودودیؒ نے شروع کیا۔ تحریک اٹھائی' جماعت بنائی۔ میرے نزدیک ان سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں ''حزب اللہ'' بنائی تھی جو بیعت کی بنیاد پر تھی۔ اس حوالے سے میرا یہ پس منظر ہے۔

پھر تین اعتبارات سے مَیں اپنا رشتہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے جوڑتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ شیخ الہندؒ کا ترجمہ قرآن اور اس پر جو حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھے وہ میرے لیے قرآن فہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ پھر ''تفہیم القرآن'' بھی ہے اور ''تدبر قرآن'' بھی ۔ ''تفہیم القرآن'' میں ایک چیز تشنہ ہے کہ دین میں تصوّف کی جو چاشنی ہے' باطنی کیفیات ہیں' وہ موجود نہیں۔ اس کا تحریکی انداز زبردست ہے۔ تحریک میں وہاں سے لیتا ہوں لیکن اسلاف کے ساتھ جڑنے کا معاملہ اور دین کے باطنی اور روحانی پہلو میں ان ''شیخین'' سے لیتا ہوں' شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔ پھر یہ کہ ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام کو شیخ الہندؒ نے تجویز کیا تھا کہ اس نوجوان کے ہاتھ پر بیعت کرو اور اسے امام الہند مانو۔ مولانا مودودیؒ نے بھی ''الجمعیت''

سے صحافت کا آغاز کیا تھا جبکہ شیخ الہند اس کے صدر تھے۔ یہ سارے حقائق جو اس وقت نگاہوں سے اوجھل ہیں' انہیں مَیں نے اپنی کتاب ''جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سب کچھ مَیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ جس کو بھی ان پچیس چھبیس دنوں میں کسی قسم کا کوئی تعلق خاطر قائم ہوا ہو تو وہ سنجیدگی سے سوچے۔ ان چیزوں کا مطالعہ کرے۔

تعاون کی صورتیں

اب آخری بات یہ ہے: {مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ} ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟'' اس مدد کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ جو لوگ میری فکر سے متفق ہو گئے' جو طریقہ کار ان کے سامنے آیا اس کو بھی انہوں نے مان لیا' اگر وہ مجھ سے واقف بھی ہیں اور مجھ پر اعتماد بھی کر سکتے ہیں تو تاخیر نہ کریں۔ بیعت کریں اور تنظیم اسلامی میں شامل ہو جائیں۔ اگر وہ یہ نہیں چاہتے اور بیعت کے معاملے میں فوری طور پر کوئی

اقدام نہیں اُٹھا سکتے تو یہاں کی انجمن خدام القرآن کے رکن بن جائیں۔ ایک سالہ کورس میں وقت لگائیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم پر کئی کئی سال لگائے جاتے ہیں۔ دین کے لیے کیا زندگی کا ایک سال بھی نہیں نکال سکتے! اللہ پوچھے گا کہ تم نے انگریزی تو اتنی پڑھ لی کہ انگریزوں کو پڑھا دو جبکہ عربی اتنی بھی نہیں سیکھی کہ میری کتاب کو براہِ راست سمجھ سکو! ایک سالہ کورس انہی لوگوں کے لیے شروع کیا گیا ہے جو پڑھے لکھے جاہل ہیں۔ ایک طرف کسی مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے جبکہ دوسری طرف قرآن کی الف بے معلوم نہیں۔ تیسری صورت ''تحریک خلافت'' سے وابستگی ہے۔ اس کی دو شکلیں ہیں۔ جو شخص معاونِ تحریک خلافت ہوگا' وہ تنظیم اسلامی کے تابع ہو گا لیکن بیعت کیے ہوئے نہیں ہوگا۔ جو بیعت کرتا ہے وہ تنظیم اسلامی کا رفیق کہلاتا ہے۔ اگر وہ معاون نہیں بن سکتا تو ہمارے لٹریچر کو پھیلانے کے لیے وسائل میں حصّہ ڈالے۔ کوئی صاحب ِاستطاعت اگر ۵۰۰ روپے ماہانہ تحریک خلافت کو دے سکتا ہے تو وہ اس کا رکن بن جائے گا۔ یہ ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے جس کے سارے حساب کتاب انجمنوں کی طرح رکھے جاتے ہیں۔ یہ چار شکلیں ہیں جس کی صورت میں آپ میرے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں' میرے مشن میں شریک ہو سکتے ہیں۔

بیعت کے اجزاء

اب آخر میں مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری بیعت کے تین جزو ہیں۔ پہلا جزو تین نکات پر مشتمل ہے:

(۱) اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اسی پر تو ہمارے دین کی بنیاد قائم ہے' لیکن بیعت کے وقت اسے تازہ کرنا کہ آج مَیں پھر شعوری طور پر یہ گواہی دے رہا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ تنہا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔

(۲) اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ ''مَیں استغفار کرتا ہوں اللہ کی جناب میں اپنے تمام گناہوں سے۔'' اے اللہ! اب تک جو ہوا' اُسے معاف فرما دے۔

(۳) وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ''اور (پروردگار!) مَیں تیری جناب میں توبہ

کرتا ہوں' خلوصِ دل کے ساتھ''۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ط} -------یہ پہلا حصّہ ہے۔

ہماری بیعت کا دوسرا حصّہ اللہ سے عہد ہے۔ اللہ کے اور بندے کے درمیان بیع و شراء ہے' بفحوائے: {اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَ اَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ط}(التوبۃ:۱۱۱) ''یقیناً اللہ نے اہلِ ایمان سے اُن کے جان و مال جنّت کے بدلے خرید لیے ہیں۔'' جنّت اُس کے پاس ہے وہ آپ کو دے گا اور آپ سے وہ جان اور مال مانگ رہا ہے۔ وہ بیع کیا ہے؟ اِنِّیْ اُعَاھِدُ اللّٰہَ ''بے شک مَیں اللہ سے عہد کرتا ہوں'' اَنْ اَھْجُرَ کُلَّ مَا یَکْرَھُہٗ ''کہ مَیں ہر اُس چیز کو چھوڑ دوں گا جو اُسے پسند نہیں ہے''۔ وَاُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِہٖ جُھْدَ اِسْتِطَاعَتِیْ'' اور اپنے مقدور بھر اُس کی راہ میں جہاد کروں گا۔'' وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ ''اور اپنا مال بھی خرچ کروں گا' جان (اور وقت) بھی صَرف کروں گا'' لِاِقَامَۃِ دِیْنِہٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِہٖ ''اُس کے دین کو قائم کرنے کے لیے اور اُس کے کلمے کی سربلندی کے لیے۔''

اب تیسرا حصّہ آیا: وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ '' اس مقصد کے لیے اُبَایِعُکَ ''مَیں آپ سے بیعت کرتا ہوں'' عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ ''سمع و طاعت پر'' کہ سنوں گا بھی اور مانوں گا بھی۔ یہاں سے وہ حدیث شروع ہو رہی ہے۔ لیکن اس میں ایک لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے: فِی الْمَعْرُوْفِ۔ یعنی آپ کا ہر حکم سنوں گا اور مانوں گا بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ حضور ﷺ سے جو بیعت کی گئی تھی اس میں یہ الفاظ نہیں تھے' اس لیے کہ آپ ﷺ تو کوئی غلط حکم دے ہی نہیں سکتے تھے۔ آپ ﷺ معصوم تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ ''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم آپ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے''۔ ہم نے اس میں بس یہ اضافہ کیا ہے کہ: عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْمَعْرُوْفِ یعنی شریعت کے دائرے کے اندر اندر سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی۔ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ ''چاہے مشکل ہو چاہے آسانی''۔ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ

''چاہے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں اور چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے''۔وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا''اور چاہے ہم پر آپ دوسروں کو ترجیح دے دیں۔ ''ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہم آپؐ کے پرانے ساتھی ہیں ،لیکن آپ نے ایک نووارد کو ہم پر امیر بنا دیا۔یہ آپ کا صوابدیدی اختیار ہے۔جس کو چاہیں ،ہم پر ترجیح دے دیں۔

یہ امر قابلِ توجّہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نہایت باریک بینی سے جماعتی زندگی میں فتنے اٹھنے کے تمام دروازے ایک ایک کر کے بند کیے ہیں۔ وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ ''اور جنہیں آپ امیر بنا دیں گے' ان سے ہم جھگڑیں گے نہیں''۔ ان سے تعاون کریں گے ' ان کی اطاعت کریں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ)) ''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی''۔ ((وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ، وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ))(متفق علیہ)''جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی''۔عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آخری بات یہ بیان ہوئی : وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا ' لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ(متفق علیہ)''ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق کی بات ضرور کہیں گے'اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی پروا نہیں کریں گے''۔ مشورہ دیں گے' ہم اپنی بات دل میں نہیں رکھیں گے۔ اپنی رائے کو روکیں گے نہیں۔ حق بات کہیں گے' لیکن اسے کہہ کر پھر ہم فارغ ہوں گے۔ اس کے بعد جو فیصلہ امیر کا ہوگا اس کی اطاعت کریں گے۔

اب آخر میں ان آیات کا ترجمہ سن لیجیے جو مَیں نے ابتدا میں تلاوت کی تھیں۔ درمیانی آیت کا ترجمہ تو کر دیا گیا تھا' اس سے پہلے کی دو آیتوں اور اس کے بعد کی دو آیتوں کا ترجمہ اس پکار کے حوالے سے سنیے جو آپ کے سامنے آئی ہے: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ} ''اے اہلِ ایمان !

لبیک کہو اللہ اور اُس کے رسول(ﷺ)کی پکار پر جبکہ وہ تمہیں پکاریں جس چیز سے کہ تمہیں زندگی ملے گی''۔ غزوۂ بدر سے پہلے بظاہر موت نظر آ رہی تھی لیکن اس سے تو زندگی مل رہی ہے۔ {وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِہٖ} ''اور جان لو کہ اللہ بندے اور اُس کے دل کے درمیان حائل ہوجایا کرتا ہے۔'' اگر حق کے واضح ہو جانے کے بعد انسان اسے قبول نہ کرے تو ایک وقت آتا ہے کہ اللہ بندے اور اُس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے{وَ اَنَّہٗٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾}''اور پھر اُسی کی طرف تم جمع کر دیے جاؤ گے۔'' {وَ اتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَآصَّۃً} ''اور ڈرو اُس فتنے سے جو صرف گناہگاروں کو لپیٹ میں نہیں لے گا''۔ گندم کے ساتھ گھن بھی پسے گا۔ {وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾}''اور جان لو اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

پھر وہ آیت آئی تھی: {وَ اذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمْ وَ

اَیَّدَکُمۡ بِنَصۡرِہٖ وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿ ۲۶ ﴾}۔اور اس کے بعد کی دو آیات ہیں: {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَخُوۡنُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ} ''اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول(صلی اللہ علیہ وسلم) سے خیانت مت کرو''۔ جو وعدہ کیا ہے ''سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا''اُس کو پورا کرو ۔{وَ تَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿ ۲۷ ﴾} ''اور اپنی امانتوں کے اندر جانتے بوجھتے خیانت نہ کرو''۔ اور جان لیجیے ہمارے پاس یہ پاکستان سلطنت خداداد اس وقت سب سے بڑی امانت ہے ! {وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ۙ}''اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں''----- تمہیں بھی ڈر ہے اولاد اور مال کا۔ صرف یہی روکتے ہیں اللہ کے راستے میں جدّوجُہد سے۔ صرف یہی بیڑیاں پڑی ہیں۔ {وَّ اَنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿ ۲۸ ﴾ } ''اور یقیناً اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن مجید کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے اور اس کے مطابق صحیح معنوں میں اپنی زندگیاں گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

بارک اللہ لِی ولکم فی القرآن العظیم ، ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم